WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
حمیدی
ایم-جے-زیب
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

(ناول)

ایم - جے - زیب

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Zeb, M. J.
Aalamgir/ M. J. Zeb.- Lahore :
Sang-e-Meel Publications. 2003.
174p.
1. Urdu Adab - Novel.
I. Title.

2003.
نیاز احمد نے
سنگ میل پ
سے شائع ک

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall) P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

انتساب

والد اور والدہ کے نام،
تمام تر غلطیوں کے باوجود جن کی
رحمت کا سایہ میرے سر پر ہے۔

دروازہ دھماکے سے کھلا اور بابر لڑکھڑاتے ہوئے باہر گلی میں آ گرا۔

"یہ ہے تیری عالمگیری"، پروفیسر طفیل نے چوکھٹ پہ آتے ہوئے اس کی کمر پر ایک اور لات ماری۔ بابر بلک کر پلٹی کھا گیا۔

"تو.....! تو کیا عالمگیری کرے گا، تو صرف ہمیں کھائے گا، ہمیں! ہمیں......" پروفیسر طفیل نے اسے مسلسل لاتوں پر رکھ لیا۔

"بس کرو جی بس کرو میرا کلیجہ پھٹ جائے گا"، بابر کی والدہ روتی ہوئی پروفیسر طفیل کی ٹانگ سے لپٹ گئی، "اب اور........"۔

"تو چھوڑ دے رضیہ! آج میں اسے عالمگیر بنا کر چھوڑوں گا! بنا کر چھوڑوں گا!"

"ہائے اللہ جی!!"

" کیا ہوا؟ کیا ہوا!"

"پروفیسر طفیل صاحب......."

گلی میں موجود کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آئے، آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیاں کھل گئیں۔

"پروفیسر صاحب!"

" چھوڑ دو"، پروفیسر طفیل دھاڑے، "ہٹ جاؤ!"

"پروفیسر صاحب ہوش کریں"، انہیں پکڑنے والوں میں سے ایک آدمی

بولا، "بھابھی کا کچھ خیال کریں!"۔

پروفیسر طفیل نے وحشت زدہ نظروں سے چوکھٹ پر گری اپنی بیوی کو دیکھا۔ ان کا خون سرد پڑ گیا۔ وہ چکرا کر دروازے کے کواڑ سے ٹکرائے۔

"پروفیسر صاحب!"

کچھ نوجوانوں نے بابر کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور اس کے شلوار قمیص جھاڑنے لگے۔

بابر ایک مجسمے کی طرح ساکت تھا مگر اسے اپنی جھکی ہوئی پلکوں میں سے باپ کا سینہ اٹھتا بیٹھتا نظر آ رہا تھا اور باپ کی اکھڑی سانسوں کی دھونکنی اس کے کانوں میں سائیں سائیں کرنے لگی۔

پروفیسر طفیل نے سہارا دینے والوں کے ہاتھ پرے دھکیل دیئے۔ ان کے سینے میں موجود دل انگارے کی طرح دھک رہا تھا، جس کی حدت سے انہیں اپنی سانسیں پگھلتی محسوس ہونے لگیں۔ آنسو پیتے ہوئے وہ جھکے اور اپنی بیگم کو سہارا دینے لگے۔

"اٹھ رضیہ بیگم " مگر رضیہ بیگم چوکھٹ پر پڑی رہیں۔

"اٹھ رضیہ بیگم " پروفیسر طفیل نے انہیں سہارا دے کر اٹھایا تو ایک سسکی لے کر وہ ان کے کندھے سے لگ گئیں۔

بابر کے ہاتھ مسلسل ٹھوکریں کھانے سے کانپنے لگے مگر وہ بت بن کر کھڑا رہا۔ اس حالت میں اسے دنیا گھومتی دکھائی دینے لگی۔ پروفیسر طفیل نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنی بیگم کو سہارا دیتے ہوئے گھر کے اندر لیجانے لگے۔

"جاؤ بھائی جاؤ"، انہوں نے پیچھے آنے والوں کو روکا، "سب جاؤ"۔ ایک مردہ ہاتھ سے انہوں نے دروازے کے کواڑ کو چوکھٹ کی طرف دھکیل دیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی بابر نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا، اس کی بجھی نظریں سامنے کھڑے ملک آصف کے سینے پر گڑ گئیں۔ جذبات میں بھیگی آنکھیں پتھرائیں اور ملک

آصف کی ہیئت میں سے دروازے کے پار دیکھنے لگیں۔

ملک سحر زدہ ہو کر ان آنکھوں کے اندوہ میں جھانکنے لگا۔ بابر نے نظریں جھکا لیں، ایک آنسو بہہ کر اس کے گال پر پڑی گرد میں سیاہ لکیر کھینچتا چلا گیا۔

" کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو"، ملک نے افسردہ ہوتے ہوئے سوچا۔

خدا نے اسے متوازن اور ٹھوس جسم عطا کیا تھا، وہ باقی لڑکوں سے قد میں کچھ اونچا تھا، اس کے جبڑے پر بلوغت کی شیو پھیل رہی تھی مگر گالوں میں بچپن کی تازگی ابھی باقی تھی۔ کھڑی ناک کے نیچے ہلکی سی مونچھ میں ایک چھوٹے سے زخم کی سرخی اس کی تازگی کی علامت تھی۔ پیشانی پر بکھرے بال اس کی اونچائی چھپا رہے تھے۔ ہم عمر لڑکوں میں کھڑا وہ ان کا سردار لگ رہا تھا۔

ملک آصف نے بے اختیار سر ہلایا۔ " قسمت " اس نے سوچا۔

" چلو"، وہ کرخت آواز میں لڑکوں سے مخاطب ہوا، " جاؤ اس کا منہ ہاتھ دھلاؤ، کوئی بوتل پلاؤ اسے۔ چلو! چلو، چلو سب یہاں سے "

مکانوں کی کھڑکیاں بند ہونے لگیں۔

" چل یار"، طاہر ہراساں سی آواز میں بابر سے مخاطب ہوا۔

"ہاں چل"، وہ بابر کو نرمی سے دھکیلنے لگے۔ بابر نے قدم اٹھایا تو اس کی ٹوٹی ہوئی چپل پاؤں سے گر گئی۔

" حامد! جا اس کے لیے جوتی لیکر آ"، حامد ایک لحظے کے لیے جھجکا اور پھر اپنے گھر بھاگ گیا۔ باقی وہیں کھڑے رہے۔

بابر انتہائی مشکل سے اپنی سانسوں پر قابو پانے لگا۔ اس کا دل کانوں میں دھڑک رہا تھا اور پھیپھڑے لمبی سانسوں کے لئے پھول رہے تھے مگر وہ جبراً پرسکون انداز میں سانس لینے لگا۔ اس کوشش میں اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرہ چھانے لگا۔

اس نے ہاتھوں پر لگی خراشوں کا معائنہ کیا پھر پرسکون انداز میں جھک کر گھٹنوں پر سے گرد صاف کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ کپکپائے پر کسی نے نہ دیکھا۔ دوست منہ کھولے

بابر کی ہر حرکت دیکھ رہے تھے، جب وہ جھک کر سیدھا ہوا تو اس کے سپاٹ چہرے پر نظر پڑتے ہی ان کی وفاداری نے جوش مارا۔ اتنے میں حامد بھی آ گیا۔ بابر نے طاہر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جوتی پہنی اور پانچوں لڑکے چل دیئے۔

وہ طاہر کی بیٹھک میں آ کر بیٹھ گئے۔

"میں کچھ کھانے پینے کو لے کر آیا" طاہر بولا "چل آ" اس نے بابر کو اشارہ کیا۔

غسلخانے میں پہنچ کر بابر نے اندر سے کنڈی لگائی اور ٹگ، ٹگ کی آواز کے ساتھ پانی کی موٹر چل پڑی۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور قمیص اتار دی۔ جہاں جہاں باپ کے ہاتھ لگے تھے جامنی رنگ کے نشانات واضح ہو رہے تھے۔ اس نے بازو گھما کر دیکھے، پھر وہ اچھلنے لگا، اس نے جھک کر پیروں کو دس بار ہاتھ لگایا۔ نہیں، اپنی زندگی کی شدید ترین مار کھانے کے باوجود وہ صحیح سلامت تھا، اور کسی سے بھی لڑ سکتا تھا، اور کسی کو بھی چت کر سکتا تھا۔ اس نے رک کر پھر اپنا چہرہ شیشے میں دائیں سے بائیں دیکھا، اور سینہ پھلاتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس کا سر چکرایا اور وہ ٹونٹی تھام کر کھڑا ہو گیا۔

"کہا بھی تھا ابو مجھ سے اور پڑھائی نہیں ہوتی" وہ سر جھکا کر سوچنے لگا، "کہا بھی تھا مجھے کام پر ڈال دیں پر نہیں! پڑھو پڑھو پڑھو"، اس نے ٹونٹی اس زور سے بھینچی کہ ہاتھ کانپنے لگا، "پر مجھ سے نہیں پڑھا جاتا نہیں پڑھا جاتا!" بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ دیوار پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں لینے لگا۔

"امی جان!" وہ رویا "آپ ایم ایس سی کر کے پروفیسر لگ گئے تھے ابو، مجھ سے ایف ایس سی نہیں ہوتی نہیں ہوتی ابو! ہم آپ کی طرح نہیں پڑھ سکتے!"

بابر منہ کھول کھول کر بغیر آواز کے رونے لگا اور اس کی ہچکیاں موٹر کی آواز میں دم توڑنے لگیں۔

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا، کہیں دور لے جا کر کتے

کی طرح گولی مار دیتے پر یہ نہ کرتے!" وہ اپنی مٹھیاں بھینچ بھینچ کر زور لگانے لگا، "ساری عمر جن لوگوں کے بیچ رہا انھی میں بے عزت کر دیا، میری عالمگیری کو میرے ہی لئے طعنہ بنا دیا!"

"عالمگیری!" بابر یک لخت تن کر کھڑا ہو گیا، اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں "عالمگیری نہیں مرے گی"

"کس چیز کی عالمگیری؟ کیا پہنوں گا؟ کیا کھاؤں گا؟ کہاں جاؤں گا؟"

اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر خود کو شیشے میں تکتا رہا، پھر خاموشی سے غسل کرنے لگا۔

طاہر کھانے کے لیے کچھ سموسے اور پینے کے لیے کچھ بوتلیں لے آیا تھا۔ بابر نظریں جھکائے کمرے میں داخل ہوا اور کسی سے آنکھ ملائے بغیر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"لو" طاہر نے سموسوں کی پلیٹ اس کے آگے کر دی۔

"طاہر مجھے دودھ کا ایک گلاس لا دو"

"اچھا" طاہر دودھ لینے چلا گیا اور بابر نظریں جھکائے اپنے ناخنوں پر غور کرنے لگا۔

اظہر اور ندیم نے اسے دیکھا اور پھر ان کی نظریں ملیں۔ ندیم کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اظہر نے افسردہ ہو کر نظریں جھکا لیں۔

"کل کے میچ کا کیا بنا؟" اظہر نے ندیم سے پوچھا۔

"ڈرا ہو گیا" ندیم چوکڑی لگا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیوں؟"

"ایک تو بابر نہیں کھیلا" اس نے بابر کی طرف اشارہ کیا "ایک ہم جیتے ایک وہ' فائنل کا اب پتہ نہیں کب ہو؟"

"تو فائنل ابھی کیوں نہیں ہو رہا؟"

"بابر اور طاہر بتائیں گے"۔

"ہوں" اظہر سموسے چٹنی میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگا۔ اتنے میں طاہر آ گیا۔ بابر نے اس سے دودھ کا گلاس لیا اور خاموشی سے پینے لگا۔

"لو سموسے لو"

"نہیں یار" بابر نے گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔

"طاہر، پروفیسر صدیق تجھے بلا رہے تھے۔ مجھے بتانا یاد نہیں رہا" ندیم بولا۔

"کیوں؟ وہ کیوں بلا رہے تھے؟"

"پتہ نہیں کالج کا کوئی کام ہوگا"

"کب بلایا ہے انہوں نے؟"

"آج شام کو"

"اچھا میں دیکھ لوں گا، ویسے اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔ باپ کی دُکان پر بیٹھو گے؟"

"نہیں بی اے کے بعد"

"ہم تو بھئی مزدوری کریں گے"، بابر نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا اور سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"چھ سے آٹھ گھنٹے روزانہ!"

"پاگل مت بن! ابھی پروفیسر صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو چل کر ان سے معافی مانگ"۔ طاہر بولا

بابر خاموش ہو گیا، وہ سب باتوں میں لگ گئے۔

اس کا دل خراب ہونے لگا، اب گھر کیسے جایا جائے۔ ماں کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی اور وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

"میں کیا کروں یار؟"، اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے اور وہ ناخن سے ابرو کھرچنے لگا۔ "یا رب یہ کیا...."

"اگر میں کشمیر چلا جاؤں" ایک سوچ ابھری، اور وہ پوری سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ "کشمیر، ہاں تین مہینے کی ٹریننگ اور پھر جہاد، پھر تو افغانستان بھی جایا جا سکتا ہے، دونوں میں سے کون بہتر ہے؟ کشمیر یا افغانستان؟"

وہ اس پر غور کرنے لگا۔ "کشمیر بہتر رہے گا ایک تو خوبصورت بہت ہے، افغانستان میں مجاہدین تو اب ختم ہو گئے ہیں۔"

پھر وہ سوچنے لگا کہ لشکر جہاد کے دفتر جانا چاہیے۔ مگر چپکے سے، کسی کو بھی بتائے بغیر۔ اس کا ہاتھ جیب پر گیا اور دفعتاً اسے پیسوں کا خیال آیا۔ اسے احساس ہوا کہ جیب میں صرف دس بیس روپے تھے۔ سب امیدیں جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں اور وہ ایک سسکی سی لے کر رہ گیا۔

"چلو اب اور پریشان مت ہو"، طاہر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا، "یوں سوچنے سے کیا فائدہ؟ آرام کرو، چلو اٹھو یار"

تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو اندر باجی سے کہہ کر منگوا لینا۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں" یہ کہتے ہوئے طاہر باقی دونوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

بابر نے اندر سے چٹخنی لگا لی۔ وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر گیا اور بے ترتیب سوچیں تنکوں کی طرح اس کے ذہن میں اڑنے لگیں۔ پریشانی سے اس کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ اسے ابکائی آئی اور وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وی سی آر پر اسے ایک انگریزی فلم پڑی نظر آئی اور اس نے لپک کر ٹی وی، وی سی آر آن کیا اور آواز بند کر کے فلم دیکھنے لگا۔

روشن جھماکوں کے ساتھ سکرین پر گولیاں چلنے لگیں، آگ کے گولے آسمان چھونے لگے، موٹر سائیکل اور کار دوڑیں، جوڈو کراٹے کے مظاہرے، بابر خالی الذہن ہو کر فلم دیکھتا رہا۔ اچانک وہ کرسی سے اٹھا اور بیٹھک کا دروازہ کھول کر اپنے گھر کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی گلی میں سات مکان چھوڑ کر آٹھواں گھر اس کا تھا۔ وہ تذبذب کے

عالم میں گھر کی چوکھٹ کو گھورنے لگا۔ یکدم دروازہ کھلا اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

پروفیسر طفیل نے باہر آ کر ہاتھ میں پکڑا ابا بر کا ٹیپ ریکارڈر سڑک پر دے مارا اور وہ سڑک سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا۔

بابر سکتے میں آ گیا۔

پروفیسر طفیل نے باہر نکل کر ٹیپ کو پوری قوت سے ٹھوکر ماری اور وہ اڑتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی اور نالی میں گر گئی۔ پروفیسر طفیل گھر کے اندر گئے اور آڈیو کیسٹوں کا ایک پورا ریک اٹھا لائے۔ وہ بھی انہوں نے سر سے بلند کرتے ہوئے سڑک پر دے مارا۔ کیسٹوں کے پرخچے اڑ کر دور تک بکھرتے چلے گئے۔

بابر کے کانوں میں کتابیں پھٹنے کی آواز سنانے لگی۔ ایک ایک کر کے اس کی ایف ایس سی کی کتابیں پھٹے کاغذ اڑاتی ہوئی روڈ پر آ کر گرنے لگیں۔ پروفیسر طفیل ایک بار پھر باہر نکلے مگر بابر کی روتی ہوئی والدہ نے چوکھٹ پر آ کر ان کا بازو پکڑ لیا اور انہیں کھینچتی ہوئی واپس گھر کے اندر لے گئیں۔ بابر کے چھوٹے بھائی عامر نے دروازے پر آ کر بربادی کا یہ منظر دیکھا اور وہ چوکھٹ میں بیٹھ کر رونے لگا۔ پروفیسر طفیل نے واپس آ کر اسے گود میں اٹھایا اور گھر کے اندر لے گئے۔ دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔

بابر بیٹھک کے دروازے کے ساتھ لگا نہ جانے کتنی دیر تک سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ اس نے چونک کر خود کو سنبھالا۔ کسی نے دیکھا تو نہیں؟ باہر نکل کر اس نے دونوں طرف گردن گھما کر دیکھا مگر جھلستی دوپہر میں گلی ویران تھی۔

بابر اندھا دھند اپنے گھر کی طرف دوڑا۔ گھر کے سامنے آ کر رکتے ہوئے اس کا جی چاہا کہ دروازہ توڑ کر اندر جا کر اپنے ابو کو گریبان سے پکڑ لے۔

"کیوں؟!!" اس کا ذہن چلایا۔

اندر سے عامر کے مسلسل رونے کی آواز آ رہی تھی، اور بابر کو علم تھا کی امی ابو کو کمرے میں لے جا کر انہیں کوس رہی ہوں گی۔ اک سسکی لے کر بابر پیچھے ہٹا اور

کیسٹوں کے پرخچے اس کے پیروں کے نیچے آ کر چٹخے۔ اس نے نیچے دیکھا، فزکس کی پھٹی ہوئی کتاب کا ایک صفحہ اس کے پیروں کے نیچے تھا۔ صفحے پر ایک سرکٹ کا ڈایا گرام تھا اور حاشیئے میں ابو کی لکھائی تھی جب انہوں نے چھٹی کا ایک پورا دن لگا کر وہ سبق اس کے دماغ میں ٹھونسا تھا۔ بابر بے یقین آنکھوں سے کیسٹوں کے ٹوٹے خول دیکھنے لگا۔ ابو نے اس کی ہستی کو گھر سے مٹا دیا تھا۔

بابر گھٹنوں پر گر کر جلدی جلدی خول، کیسٹیں اور پھٹی کتابیں سمیٹنے لگا۔ سمیٹتے ہوئے اس کی نگاہیں کسی ایک مکان پر نہ ٹھہر رہی تھیں۔ وہ ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ کوئی آ تو نہیں رہا؟ کتابیں اکٹھی کر کے اس نے اٹھائیں تو پھٹے صفحے پھسلتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے گرتے چلے گئے۔ اس نے کتابیں سینے سے لگائیں اور گلی کے منہ کے ساتھ پڑے کچرے کے ڈبے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ڈبے کے پاس پہنچ کر اس نے کتابیں کچرے میں پھینکیں تو ایک بلی چھلانگ لگا کر ڈبے میں سے کود گئی۔

بابر واپس بھاگا۔ کیسٹیں سمیٹ کر اس نے جھولی میں بھریں اور بھاگتے ہوئے، انہیں سنبھالتے ہوئے، انہیں بھی کچرے میں لا پھینکا۔ وہ واپس آیا اور نالی میں پڑا ٹیپ ریکارڈر نکال لے گیا۔ ریکارڈر کے پرزے اس زور سے کھڑکھڑائے کہ شاید مردے جگا دیتے۔ بابر نے اسے بھی لا کر پوری قوت سے کچرے میں دے مارا۔ وہ پھر واپس بھاگا۔ چھوٹے چھوٹے پرزے اس نے پاؤں سے اکٹھے کرتے ہوئے نالی میں پھینک دیئے۔ صفحے اٹھا کر اس نے جیبوں میں ٹھونس لیئے۔ وہ پھر ڈبے کی طرف بھاگا۔ راستے میں رک کر اس نے طاہر کی بیٹھک کا دروازہ بند کیا اور پھر ڈبے میں ایڑھیاں اٹھا کر جھانکنے لگا۔

کیسٹوں کے خول اور ٹیپ دھوپ میں چمک رہے تھے۔ اس نے سر پیٹ لیا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟ اس نے آستین چڑھائی اور ٹیپ تک ہاتھ پہنچانے لگا، ٹیپ اس کی پہنچ سے دور تھی۔ اس نے شلوار کے پائنچے چڑھائے اور دیوار پر ہاتھ رکھتے ہوئے ڈبے میں کود گیا۔

کچرے کا ڈبہ دودھ کے خالی ڈبوں، شاپروں، ہڈیوں اور گلی ہوئی چیزوں سے بھرا ہوا تھا، اس کی ٹانگیں پنڈلیوں تک اس گند میں دھنس گئیں۔ گند میں سے اٹھتی سڑانڈ سے اس کا دماغ پھٹنے لگا مگر وہ پرواہ کیے بغیر اپنی پھینکی ہوئی چیزیں کچرے میں چھپانے لگا۔ اس کے بازو کہنیوں تک بدبودار غلاظت میں لتھڑ گئے مگر وہ تب تک نہ رکا جب تک اس کی ذلت کا آخری سراغ بھی گند کے اندر غائب نہ ہوگیا، پھر وہ چھلانگ لگا کر ڈبے سے باہر نکل آیا۔

اسے خود سے گھن آنے لگی۔ اس کے بازو اور ٹانگوں سے غلاظت بہ رہی تھی، اس نے پریشان ہوکر سوچا اب کیا کرے۔ دفعتاً اسے خیال آیا گلی کے ساتھ ہی مین روڈ کراس کر کے قبرستان تھا، اور وہاں ایک نلکا تھا۔ وہ بازوؤں کو جسم سے دور رکھتے ہوئے ٹانگیں کھول کھول کر چلتے ہوئے قبرستان کی جانب بڑھنے لگا۔

قبرستان پہنچ کر اس نے نلکے کے نیچے گیلی زمین پر سوئے کتے کو لات مار کر بیدار کیا اور پھر نلکے کے نیچے بیٹھ کر کراہت کے ساتھ ہاتھ پیر مل کر دھونے لگا۔ نلکے کا پانی ٹھنڈا تھا۔ اس نے ہاتھ اچھی طرح دھونے کے بعد کئی چلو بھر پانی پیا، اور خاصی دیر تک بیٹھ کر غسل کرتا رہا۔ آس پاس قبریں تھیں جن کے مکیں اس کے راز سے بے پرواہ تھے۔ اچھی طرح دھونے کے باوجود بازوؤں سے مسلسل بدبو اٹھ رہی تھی اور اس نے پریشان ہوکر سوچا کہ اب کیا کرے؟ اچانک اسے خیال آیا اور وہ ایک قبر کے پیر میں بیٹھ کر ٹانگوں اور بازوؤں پر مٹی ملنے لگا۔ اچھی طرح ملنے کے بعد جب اس نے مٹی دھوئی تو اعضاء سے بدبو غائب تھی۔ اس ننھی سی فتح پر وہ بے اختیار مسکرا کر رہ گیا۔

ایک گہری سانس لے کر وہ اٹھا اور ہاتھ نچوڑتے ہوئے ارد گرد دیکھنے لگا۔ قبرستان میں قطار در قطار قبریں تھیں اور اونچی، نیچی، پختہ اور کچی قبروں کے بیچ گھاس پھونس، پودے اور سایہ دار درخت تھے۔ نجانے کیوں اسے اپنی روح کے اندر سکون کا احساس ہونے لگا۔ قبرستان میں محلے کی نسبت ٹھنڈک کا احساس تھا۔ بیری کے سائے میں ایک پختہ لحد کے کنارے بیٹھ کر وہ سستانے لگا۔

"اب میں اکیلا ہوں"، اس نے بیری کے پتے توڑتے ہوئے سوچا، "بالکل اکیلا! ہمیشہ سوچتا تھا کہ اس جیل نما گھر سے چھوٹ جاؤں، چھوٹ گیا! باپ نے اٹھا کر باہر پھینک دیا، اب کیا؟"

اس کتے نے دیوار پر چڑھ کر باہر کو دیکھا۔

"آجا بھئی" اس نے کتے سے کہا "معاف کرنا اس وقت تمہیں نیند سے اٹھانا پڑا۔ اب آجاؤ بہت جگہ ہے اس قبرستان میں دو زندہ جانوں کے لیے۔"

کتے نے باریک سی آواز نکالی اور باہر سڑک پر کود کر غائب ہوگیا۔

"جیسے تمہاری مرضی یار! شاید تمہارا اور کوئی ٹھکانہ بھی ہے، میں تو بہن مرحومہ زینب بیگم کے قدموں میں بیٹھا ہوں مجھے کہاں جانا ہے؟"

"صحن میں پڑی میری سائیکل ابو کو باہر پھینکنی یاد نہیں رہی!" وہ تلخی سے مسکرایا۔

"ہاں، اور الماری میں لٹکے ہوئے کپڑے بھی، کپڑے تو خیر عامر کے کام آجائیں گے"

"سٹور میں پڑا میرا بیٹ۔ اُف خدایا کتنی نفرت ہے انہیں اس بیٹ سے"

"ابو!" وہ ہنسا "اصل چیز تو گھر میں ہی پڑی ہوئی ہے!"

"پروفیسر طفیل احمد صاحب"، اس نے دانت پیس لیے "ایک بیٹے کو گھر سے نکال کر اب دوسرے کو پڑھا رہے ہونگے"۔

"کیا کہتے ہیں بی ایس سی کے لڑکے انہیں؟ پروفیسر انڈر روٹ" وہ ہنسا۔

"یاد ہے ابو جب میں نے آپ کو بتایا تھا فصیح آپ کو پروفیسر انڈر روٹ کہتا ہے تو آپ نے مجھے کہا تھا کہ اس کے نمبر مجھ سے بہتر ہیں"

"نمبر! مجھے نفرت ہے نمبروں سے"، اس نے دانت پیسے"، ہر ایک نمبر سے، ریاضی میں ہر چیز سے! آپ کا کیا خیال ہے مجھے ریاضی آتی نہیں؟ مگر آپ ہر چیز کو نمبروں میں تولتے ہیں!"

"سب کہتے ہیں ہمارے جیسا گھر ہی کوئی نہیں۔ پروفیسر صاحب جیسا گھر ہی کوئی نہیں چلا سکتا۔ کوئی فضول خرچی نہیں، کوئی قرضہ نہیں۔ ہر چیز میں حساب کتاب، کوئی فضول جذبات نہیں!" بابر چھلانگ لگا کر کھڑا ہوا اور پوری قوت سے لحد کے ساتھ اُگی بیری کو جھنجھوڑنے لگا۔

"وہ ٹیپ چار ہزار کی تھی،" بابر کانٹے دار شاخوں کو پوری قوت سے کھینچنے لگا اس کی انگلیوں سے خون رسنے لگا۔

"وہ کتابیں پانچ سو کی تھیں! اور مجھے ان سے پہلے باہر پھینکا ابو میری قیمت کیا ہے؟ یا آپ نے حساب لگا لیا ہے کہ میرے بغیر کام چل جائے گا! ہیں؟ کیوں؟ کیوں؟"

"آپ نے میری زندگی کو کتابوں میں بند کر دیا!"

"میں پڑھتا تھا! میں کسی زمانے میں پڑھتا تھا مگر تب کیا فائدہ ہوا!"

"تو پاس بھی نہیں ہوا!" اس کے والد کی آواز اس کے ذہن میں گرجی، "تو پاس بھی نہیں ہوا کتے! اور میں نے اپنی ساری زندگی تجھے بنانے میں لگا دی اور تو پاس بھی نہیں ہوا! دوسری دفعہ تو فیل ہوا ہے!" بیری بابر کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

"ابو اس طرح تو میں نہیں پڑھوں گا،" وہ ہانپتے ہوئے سوچنے لگا۔ "آپ نے مجھے کیلکولیٹر سمجھ رکھا ہے۔"

"تو نکما ہے! ذلیل! تجھے میرے گھر میں ہی پیدا ہونا تھا؟ تجھے میرے ہی منہ پر کالک ملنی تھی؟ اپنی ماں سے پوچھ اس بے حس شہر کے بچے، ہم گاؤں کی بھوک میں سے اٹھ کر یہاں پہنچے ہیں؟ تو نے کبھی بھوک دیکھی ہے؟ تو نے........؟"

"ہاں ابو میں نے بھوک دیکھی ہے"، وہ چلّایا، "میں نے پیار کی بھوک دیکھی ہے۔ میں نے جذبات کی بھوک دیکھی ہے۔ میری زندگی کا ہر فیصلہ آپ نے کیا........"

"تجھے دو دفعہ فیل کروانے کا فیصلہ بھی میں نے ہی کیا؟ کیا بھوک دیکھی ہے تو نے.........."

"ابو میں.........."

"بکواس بند کر! تو مر ہی جاتا تو ہمارے لیئے اچھا تھا!"

"ابو اس میں کونسی دیر ہوئی ہے۔ میں مر جاؤں؟" دیوانہ وار وہ اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔

"ابھی لیں ابو!" وہ اٹھ کر کوئی ایسی شیئے ڈھونڈنے لگا جو اسے موت کے گھاٹ اتار دے، "جیتے جی تو آپ نے مجھے مار ہی دیا۔ مجھے اب مر ہی جانا چاہیئے! میں یہ ذلت کی زندگی نہیں جی سکتا۔ میری عالمگیری مٹی میں مل گئی۔ میری زندگی کوڑے کے ڈرم میں چلی گئی! سب کے سامنے میں ذلیل و رسوا ہو گیا۔ سب مجھ پر ہنس رہے ہیں میں یہ برداشت نہیں کر سکتا! نہیں کر سکتا!"

ہر طرف قبریں تھیں اور درخت تھے۔ اس کی نگاہ قبرستان کی دیوار کے ساتھ لگے بجلی کے کھمبے پر پڑی اور وہ اس کی طرف دوڑا۔

دیوار پر چڑھ کر اس نے کھمبے میں لگی آڑی ترچھی ٹی آئرن کی سلاخوں میں پیر پھنسائے اور پھر چپل میں سے ٹی آئرن کی کاٹ کو برداشت کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ بیس فٹ اوپر بجلی کی تاریں گزر رہی تھیں جنھیں پکڑ کر وہ اپنی زندگی کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔

ہاتھوں اور پیروں میں آڑی ترچھی سلاخوں کے چبھنے سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں، مگر درد کی پرواہ کیئے بغیر، آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے وہ ان تاروں تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

نیچے سڑک پر ایک دودھ والا موٹر سائیکل پر سوار گزرا مگر اس کی نگاہ بابر پر نہ پڑی۔ وہ سڑک سے آٹھ دس فٹ کی بلندی پر تھا مگر تاریں اب بھی اس سے بہت اوپر تھیں۔

"اوکون ہے تو اوئے؟" ایک بلند آواز آئی اور بابر سکتے میں آ گیا۔ اس نے گردن جھکا کر نیچے دیکھا۔

آواز دینے والا قبرستان کا بوڑھا گورکن تھا جو غسلخانے سے نکل کر اپنا تہمد باندھ رہا تھا۔

اب جو بابر نے سر اٹھا کر تاروں کو دیکھا تو اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ خودکشی حرام تھی اور.........

"او! توں کی کرن لگا ایں؟!"

"مرنے لگا ہوں!"، بابر چلّایا اور کھمبے پر ایک فٹ مزید چڑھ گیا۔ مگر اب اس میں تاروں کو چھونے کی ہمت نہ رہی تھی۔

"تیرا دماغ تے نئیں خراب ہو گیا؟!" بوڑھا بابا اپنی موٹے شیشوں والی عینک سنبھال کر اس کی طرف آنے لگا۔

"نیچے اتر! چل نیچے اتر!" بابا قبرستان کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر کھمبے سے چپکے بابر سے مخاطب ہوا۔

"بابا!"، بابر چلّایا، "آج ایک قبر کھود میرے نام کی!" اس کا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر عزت بھی تو بچانی تھی اور ذہن لڑاتے ہوئے وہ نیچے اترنے کی تدبیر کرنے لگا۔

"نہیں اترنا؟ ٹھہر جا"، بوڑھے گورکن نے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور گھما کر اوپر پھینکا۔

"آہ!" بابر چلّایا۔ پتھر سیدھا آ کر اس کی ران سے ٹکرایا۔ "نہ کر بابا!"

"نہیں اترتا نہیں اترتا؟ تیری تو میں..... یہ لے!" ایک اور پتھر اڑتا ہوا آیا اور بابر نے بمشکل اپنا بچاؤ کیا۔

"یہ لے!" بوڑھے گورکن نے اپنی عینک کے دھندلے شیشوں کے پیچھے سے ایسا نشانہ لیا کہ پتھر سیدھا بابر کی ہتھیلی کی پشت پر لگا، اس کا ہاتھ چھوٹا اور وہ چلّاتے

ہوئے دس فٹ کی بلندی سے ایک کچی قبر پر آ گرا۔

"تیرا تے دماغ ہُن میں صحیح کردا آں! مرن لگا سی؟!" گورکن نے اپنا قدیم کھسہ اتارا اور بابر کے سر پر برسانے لگا، "مرن لگا سی؟ مرن لگا سی؟!"

بابر کے ہوش اڑ گئے۔ وہ پسلیوں میں خاصی تکلیف محسوس کرنے لگا کہ یک لخت اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ بوڑھے گورکن کا کھسہ "پٹاخ! پٹاخ!" کی آواز کے ساتھ اس کے سر پر سنگت دینے لگا۔

"ہن کیوں نئیں مردا؟!" بوڑھا گورکن ایک کانپتے ہاتھ سے اپنی عینک درست کرتے ہوئے بولا، "ہُن مر!"

بابر ادھ موا سا ہو کر قبر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اسے لگا کہ ذلت دنیا کی واحد ایک ایسی چیز ہے جس کی کوئی حد نہیں، جتنی چاہو لے لو۔ بخوشی ملے گی۔

"اٹھ ہن مردے اتے لیٹ گیا ہے، اوئے توں تے ہلے جیوندا ہے!"

"بابا میں ہار گیا"، بابر دھیمی آواز میں بولا، "مجھے یہاں سونے کو جگہ دے دو۔ بہت تھک گیا ہوں"۔

"ہا! بے شرم! بے غیرت ہو گیا تو! زمین وچوں ہلے نکلیا نئیں، واپس چلا اے زمین دے تھلّے"۔

"جو مرضی کہہ لے یار"۔

"اوئے اٹھ تے سہی! الماہی پے گیا ہے"

گورکن نے اسے کندھے سے پکڑ کر کھینچا۔

"نہ کر ظالم!"، بابر چلّایا، "ایک تو گراتا ہے پھر............ میری پسلیاں دکھ رہی ہیں"۔

"ہلے دکھ رہی ہیں، ہلے تے ایناں نے ٹٹنا سی، پیا رہ اتھے ہی!" یہ کہتے ہوئے بوڑھا گورکن بڑبڑاتا ہوا ایک طرف کو چل دیا اور بابر وہیں پسلیاں تھامے قبر کے سہارے لیٹا رہا۔

کچھ دیر بعد بوڑھا واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا۔ وہ آ کر بابر کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔

"چل یہ لے پی"، پیالہ پکڑ کر پانی میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے بابر لمبے گھونٹ بھرنے لگا۔ بوڑھا عینک کے پیچھے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔

"ہن دس تینوں ہویا کی اے، پاگلا تیری تے ہلے کھیڈن دی عمر ہے!"

بابر نے اسے دیکھا اور فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ عینک میں سے بوڑھے گورکن کے بڑے بڑے دیدے اسے گھور رہے تھے۔

"بابا میں پاگل نہیں ہوں اچھا! اگر مرنے لگا تھا تو اس کی بھی ایک وجہ ہے، اور وجہ یہ ہے کہ میں اس دنیا سے فارغ ہو گیا ہوں، میرا اپنا اب کوئی نہیں رہا، کوئی میری مدد نہیں کر سکتا، نہ میں خود اپنے لیے کچھ کر سکتا ہوں اور اگر تو نے میرے ساتھ زیادہ بکواس کی تو میں تیرا سر پھاڑ دوں گا، اس لیے تیری مہربانی تو جا اور اپنا کام کر! مجھے اکیلا چھوڑ دے"۔

بوڑھے کے بڑے بڑے دیدے اسے مسلسل گھورے جا رہے تھے،

"توں.... کہیا کی اے؟"

بابر جھلا کر رہ گیا مگر یہ حرکت اسے مہنگی پڑی اور وہ کراہ اٹھا۔

"پتر توں ہلے بچہ ہے۔ توں جو کہیا مینوں زیادہ سمجھ تے نہیں آیا، پر جے تو میرا سر پاڑنا چاہتا ہے تے فیر تو ہلے گبرو ہے"۔

بابر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اے تیرے پیراں تھلے کی اے؟"

"زمین"۔

"زمین اتے کی اے؟"

"میرے پیر"

"نہ پُتر"، بوڑھے نے اپنا جھریوں بھرا ہاتھ زمین پر پھیرا اور بابر کی آنکھوں

کے سامنے کر دیا۔

"اے کی اے؟"

"مٹی"

"ہاں پتر مٹی۔ ایہہ مٹی کی شئے ہے؟ پیراں وچ رُلدی اے۔ ایس جہان دی سب توں گھٹیا شئے، پر بابا فرید آخدا اے۔

فریدا خاک نہ نندیئے! خاکو جیڈ نہ کوء

جیوندیاں پیراں تلے، مویاں اپر ہوء

"کیا مطلب؟"، بابر دلچسپی سے بولا، اور بوڑھے نے ہاتھ جھاڑ کر اپنی پیشانی پر مارا۔

"بابا بتا تو سہی!"

"فرید شکر گنج کہندا اے کہ مٹی کو برا نہ کہہ! ایدے جیسا کوئی وی نہیں۔ جیوندیاں اے پیراں کے نیچے ہوندی ہے، لیکن موت کے بعد بندہ تھلے اور مٹی اتے ہوندی اے"

"واہ! یہ تو عام سی بات ہے"

"عام سی بات نہیں اے!" بوڑھا کانپتی ہوئی آواز میں چیخا۔ غصے سے اس کی آنکھیں باہر آنے لگیں۔ "یہ عام سی بات نہیں اے! جا چلا جا! جا!" بوڑھے نے پیالہ اٹھایا اور کانپتی ٹانگوں پر زور ڈالتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

تیز تیز چلتے ہوئے وہ اپنے حجرے کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟!" بابر اسے دیکھتا رہ گیا۔ حجرے کا دروازہ دھڑام سے بند ہوا۔

"سٹھیا گیا ہے بابا!" بابر نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

کچی قبر کے ڈھیلوں میں سے باریک باریک مٹی کی لکیریں زمین تک آ رہی تھیں۔

"یہ مٹی ہے"، وہ ایک ڈھیلے میں بنی لکیر کو ناخن سے کھرچنے لگا۔ ڈھیلے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹوٹ کر دوڑتے ہوئے قبر کے کنارے اُگی گھاس میں جانے لگے۔

"اس دنیا کی سب سے حقیر چیز۔ ہماری نظروں میں اس کی کوئی حقیقت نہیں مگر یہی مٹی مرنے کے بعد ہمیں اپنے اندر ملا لیتی ہے۔ ہم چاہے اپنا سر جتنا بھی اونچا کرلیں اس مٹی کے آگے ہمیں ہارنا پڑتا ہے۔ تو آخر میں کون جیتا؟"

اس نے ایک چھوٹا سا ڈھیلا اٹھایا اور انگلی اور انگوٹھے کے بیچ پیس دیا۔

"یہ مٹی عالمگیر ہے یار!" پسے ہوئے ڈھیلے کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں جھماکہ سا ہوا، "اور میں بھی عالمگیر ہوں! آج میں اس مٹی میں مل گیا ہوں، کب تک مجھے ٹھوکریں ماریں گے؟ کب تک مجھے برا بھلا کہیں گے؟ پر آخر میں جیتے گا کون؟ عالمگیر!" قبرستان میں اس کی آواز گونج اٹھی اور اوپر درخت پر بیٹھے کوے کائیں کائیں کرتے اڑ گئے۔

ہونٹ بھینچتے ہوئے وہ کھڑا ہوا۔ اس نے حجرے کی طرف دیکھا مگر اس کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ٹونٹی کے نیچے ہاتھ دھوئے، ایک جست لگا کر قبرستان کی دیوار پھلانگی اور طاہر کو ڈھونڈنے چل دیا۔

شام ڈھل رہی تھی۔

طاہر فضل دین نائی کے حمام میں بیٹھا دودھ کی بوتل پی رہا تھا۔ فضل دین کا حمام قصائی محلّہ کے لڑکوں کے لئے جمخانہ کلب کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس کسی کی جیب میں چار پیسے فالتو ہوتے وہ یہاں آکر لیدر پوشش کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر شیو ضرور بنواتا یا پھر کاٹن کی شلوار قمیص کو ایسی کلف لگواتا کہ کپڑوں کو پھاڑ کر ان میں اعضاء ڈالنے پڑتے۔

بابر، طاہر، اور محلے کے دیگر امراء کا یہ مستقل ٹھکانہ تھا جہاں وہ شام کے وقت آکر بیٹھا کرتے۔ اس وقت بھی وہاں فضل دین کا لڑکا افضل، طاہر اور شمس بیٹھے تھے۔

بابر جونہی حمام میں داخل ہوا شمس اٹھ کھڑا ہوا اور انتہائی گرمجوشی سے اس سے گلے ملا۔

"آؤ میرا عالمگیر شیر"، شمس نے بابر کی کمر بھینچی اور بابر نے مسکرا کر دانت پیس دیئے، اس کی پسلیاں دکھ رہی تھیں۔

"یقین مان پچھلی بار جو تو نے میچ جتایا ہے، تیرے بھائی کا کلیجہ شیر جتنا ہو گیا ہے!"

بابر ہنس دیا اور افضل سے ہاتھ ملا کر گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں" بابر مسکرایا، "صومالیہ کے شیر جتنا ضرور ہو گیا ہوگا۔ اب تو بلی دوڑ جیت سکتا ہے" سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

شمس بھی خالی برتن کی طرح کھنکھنایا، "بلیوں سے تو یہ شیر ضرور جیت لے

گا۔خیر،تو بتا۔اس اتوار کے لئے تیار ہے؟"

بابر ایک کنگھی اٹھا کر بال سنوارنے لگا۔اسے معلوم تھا کہ سب کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔ بال سنوار کر اس نے کنگھی جھاڑی اور کاؤنٹر پر پھینک دی۔

"میچ کون کروا رہا ہے؟"اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"سخی ورکشاپ والا"

"ٹیمیں کون کون سی ہوں گی"۔

"یار میں کہہ رہا تھا کہ اپنی بازیگر کلب کی ٹیم کھیلے پر یہ طاہر نہیں مان رہا"۔

"بابر میں صحیح کہہ رہا ہوں یار یہ........

"تو صحیح کہہ رہا ہے"، بابر نے طاہر کی بات کاٹی اور پھر شمس سے مخاطب ہوا۔

"دیکھ شمسی، ہم صرف شفقت بلوچ کی طرف سے کھیلتے ہیں اور بس!"۔

"تم لوگوں کی مرضی یار۔ ویسے سخی تم لوگوں کا ہی کہہ رہا تھا۔نور کلب کی پارٹیوں کے لئے یہ میچ ہو رہا ہے اور بہت بھاری میچ ہے یار!"

"جو بھی ہے۔سخی کو اگر اتنا ہی شوق ہے تو اس سے کہو وہ شفقت بلوچ سے بات کرے"

"ٹھیک ہے یار"۔

"اور سنا کیا حال ہے تیری چھمک چھلّو کا"، بابر نے پوچھا اور سب ہنس دیئے۔

اسی طرح باتیں کرتے کرتے شام ڈھلنے لگی۔ مکانوں کی چھتوں کے پیچھے سورج غروب ہونے لگا اور بابر مضطرب ہو کر پہلو بدلنے لگا۔رات کہاں گزاری جائے؟ ڈوبتی ہوئی روشنی میں یہ سوال ایک وزن کی طرح اس کے پیٹ میں بیٹھنے لگا۔بازار کی رنگا رنگ روشنیوں میں عورتوں کے چمکدار دوپٹے جھلملانے لگے۔اتنے میں دکان پر افضل کا باپ آ گیا اور لڑکوں کا رش چھٹ گیا۔بابر اور طاہر بھی دکان سے اٹھ آئے۔

"پروفیسر صاحب سے صلح ہوئی؟"بازار میں گھومتے ہوئے طاہر نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" طاہر واحد دوست تھا جس سے وہ دل کی بات کہہ سکتا تھا، مگر اس کے دل کے تہہ خانوں میں چھپے خوف سے وہ آگاہ نہ تھا کہ شاید ابو سے اب کبھی صلح نہ ہو سکے۔

"پھر اب؟"

"کرنا کیا ہے یار"، بابر نے مسکراتے ہوئے طاہر کے شانے پر ہاتھ رکھا "جو ہو گا دیکھا جائے گا"۔

ایک بار پھر طاہر بابر کے ان الفاظ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔اسے فخر تھا کہ اس کا دوست ایک شیر دل جوان ہے۔اگر اسے ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ...... طاہر جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"میں جہاد پہ جانے کا سوچ رہا ہوں" اور طاہر ٹھٹھک کر رک گیا۔

"یہ تو کیسی باتیں کرنے لگا ہے؟!"

"اگر میں کہوں اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے تو....؟"

"بات اتنی بگڑ چکی ہے؟"

"ہاں"

طاہر خاموش ہو گیا۔

"مگر جہاد پر جانا کوئی آسان کام نہیں" بالآخر وہ بولا۔

"کیوں؟ اس میں مشکل کیا ہے"

"اب سختی زیادہ ہو گئی ہے"

"ابھی دو مہینے پہلے زاہد بک شاپ والا کشمیر گیا تھا"

"جناب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ زاہد یہیں جوتیاں چٹخا رہا ہے"

"اچھا؟"

"ہاں! اگلی بار داتا صاحب جانا تو چار آنے بھیک اسے بھی دے آنا۔وہ پوڈر پینے لگ گیا ہے"

"نہیں یار"، بابر نے حیرت سے کہا۔

"نہیں یار کیا؟ اس لئے تجھ سے کہہ رہا ہوں تھوڑا صبر کر، تو فیل ہوا ہے، کوئی قیامت نہیں آ گئی۔ آخر وہ تیرے والد ہیں۔ غصہ ٹھنڈا ہو ہی جائے گا ان کا"

"وہ اب صرف پروفیسر صاحب ہیں میرے والد نہیں!" بابر زہر آلود لہجے میں بولا۔

طاہر نے خاموش ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔

اسی وقت بابر کا چھوٹا بھائی عامر اسے ڈھونڈتا ہوا بازار میں آ نکلا۔

"بھائی"، وہ پیچھے سے آ کر معصومیت سے بولا اور بابر ٹھٹھک کر رک گیا، اس کی رگوں میں خون سائیں سائیں کرنے لگا۔ وہ بپھر کر پلٹا اور عامر ڈر کر دو قدم پیچھے ہو گیا۔ طاہر نے لپک کر اسے سنبھال لیا۔

"کیا ہے اوئے"، بابر غرّایا، "تو ادھر کیا لینے آیا ہے؟"

"بھائی" عامر گلوگیر لہجے میں بولا، "امی نے آپ کے لیے روٹی اور کپڑے بھیجے ہیں" اس نے ہاتھ میں پکڑا شاپر بابر کی طرف بڑھا دیا۔ ایک ساعت کے لیے بابر کے جی میں آیا کہ عامر کو لات مار کر بھگا دے، اس نے طاہر کی آنکھوں میں دیکھا جو عامر کو اپنے ساتھ لگائے کھڑا تھا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ عامر ہلکی ہلکی ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شاپر لے لیا۔

"اور امی نے یہ پیسے بھی دیئے ہیں"، عامر کی ننھی سی مٹھی میں پکڑا ہوا سو روپے کا نوٹ خاصا بڑا لگ رہا تھا۔ بابر نے جھپٹ کر نوٹ جیب میں ڈال لیا۔

"اور امی کہہ رہی تھیں آپ آج رات ریاض ملکی والی خالہ حمیدہ کے گھر گزار لیں، وہ کل صبح ابو کو منا لیں گی"۔ یہ کہہ کر عامر نے طاہر سے بازو چھڑوائی اور پلٹ کر چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر بھاگتا چلا گیا۔ جب تک وہ گلی میں مڑ نہ گیا۔ بابر نیلی نیکر کے نیچے اسکے گھٹنوں کی پشت دیکھتا رہا۔

اس رات وہ گھر سے دور ریاض ملکی میں اپنی خالہ کے گھر سویا۔ چھت پر اس کا بستر تھا، اور وہ تارے گن گن کر اپنا وقت گزارنے لگا۔

"ان تاروں کے اوپر اللہ تعالیٰ رہتا ہے"، اس نے سوچا، "ان تاروں کی دنیا میں فرشتے رہتے ہوں گے۔ یہیں ایک تارا ہو گا جو ہر ستر ہزار سال کے بعد چمکتا ہے، جو جبرائیل کو حضور پاکؐ کی پیشانی پر نظر آیا تھا۔ شاید وہ آج چمک رہا ہو! اگر وہ مجھے نظر آ جائے تو میں جنتی ہو جاؤں گا"، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور چھت کے پردے کے ساتھ لگ کر آسمان کو گھورنے لگا۔ اسے کئی تارے نظر آئے، کچھ روشن، کچھ مدہم، کہیں زیادہ، کہیں کم۔ ایک دو پر اسے "وہ تارا" ہونے کا گمان بھی ہوا، لیکن نہیں، وہ تارا عام تارا نہیں ہو سکتا تھا۔ آسمان پر نظر دوڑائی تو اسے عین سر کے اوپر ایک چھوٹا سا، انتہائی مدہم سا ستارا نظر آیا، عین سر کے اوپر۔ اس کی گردن میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں، پر وہ دیکھتا رہا۔ جانے کیوں اسے لگا کہ یہ اس کا ستارا تھا۔ چھوٹا سا، مدہم سا۔ اچانک اس کی گردن میں بل پڑ گیا، اور وہ سر جھٹک جھٹک کر بل نکالنے لگا۔ جب اس نے دوبارہ سر اٹھایا تو ستارہ غائب تھا۔ لاکھ کوشش پر بھی دوبارہ نظر نہ آیا۔ آخر کار بابر تھک کر بستر پر لیٹ گیا۔

صبح بابر سو کر اٹھا تو اسے پچھلا دن ایک خواب کی طرح لگا اور وہ حالات پر اور اپنی بیوقوفیوں پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "شاید ابو بھی یہی سوچ رہے

ہوں" اس نے سوچا۔ اگر وہ واقعی کھمبے پر چڑھ کر تاروں کو چھو لیتا تو؟ وہ کانپ کر رہ گیا۔ خودکشی بزدل کرتے ہیں! اس نے حقارت سے سوچا۔

ناشتے کی میز پر وہ نئے کپڑے پہن کر خالو اور خالہ کے ساتھ بیٹھا تو خاصا ہشاش بشاش تھا۔ سب کو اپنی باتوں سے ہنساتا رہا۔ ناشتے کے بعد خالو کام پر، بچے سکول چلے گئے اور خالہ گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ وہ ایک کونے میں لگ کر گھر سے فون آنے کا انتظار کرنے لگا۔ دس بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی اور اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ماں جی؟!" اس کی امید بھری آواز ریسیور میں گونجی، مگر دوسری طرف خاموشی چھائی تھی۔

"ماں جی!"

"او نصیبوں کے مارے......! او کرم جلے......! او میری کوکھ کے کوڑھ......! تجھے ذرا بھی خیال نہیں آیا......! ماں باپ کو جیتے جی مار دیا تو نے! ہماری زندگیاں خاک میں مل گئیں......! اپنا ہی تو کچھ سوچ لیتا......! اپنے لئے ہی کچھ کر لیتا......! تو اب بولتا کیوں نہیں؟!"

بابر نے کان لپیٹ لیئے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ وہ خاموشی سے انتظار کرنے لگا۔

"جی ماں جی"

"جی ماں جی کے بچے! خدا نے کیسا پتھر دل دیا ہے تجھے......! ماں پر رحم کھا کر ہی کچھ پڑھ لیتا......! کچھ اپنے آپ پر ترس کھاتا......! ہم نے تجھ سے کیا لینا ہے! ہم تو اپنی زندگی گزار چکے۔ اب بتا کیا کرے گا تو......! بول کیا کرے گا تو......؟!"

نہ چاہتے ہوئے بھی بابر کے ذہن میں الفاظ کا زہر گھلنے لگا، مگر وہ لبوں کو تالا لگائے چپ کھڑا رہا۔

"نہ بتا ہم تیرے دشمن ہیں......؟ تو جو سمجھ کر بیٹھا ہے کہ ماں پیو پاگل ہیں

تجھے پڑھنے کو کہتے ہیں، تجھے یہ عقل کبھی نہیں آئی کہ تیری بھلائی کے لیے کہتے ہیں۔ تجھے پڑھنے کے علاوہ کبھی کچھ کہا ہے کرنے کو......؟ کبھی تیرے باپ نے کہا تجھے کہ مجھے کما کے کھلا......۔ تیرے لئے ہی تجھے کہتے رہے کہ تو پڑھ لکھ کر کچھ بن جائے...... تجھے ذرا خیال نہیں آیا کہ تو پروفیسر محمد طفیل کا بیٹا ہے......؟ تیرا باپ دوسروں کے بچوں کو پڑھا پڑھا کر کسی کو انجنیئر بنایا کسی کو باہر بھجوایا اور تو ہی فیل ہو گیا......! ہمارا اپنا بیٹا......! دوسری بار......! تو پہلے کیوں فیل ہوا......؟! تو نے تو ہمیں جیتے جی مار دیا......! مار دیا......!"

بابر کے ہونٹ کپکپائے، پر وہ چپ چاپ کھڑا آنسو پیتا رہا، ادھر اس کی ماں سسکیاں لے کر روتی رہی۔

"تیرا باپ بیمار ہو گیا ہے کل کا......! کچھ کھایا نہیں ہے اس نے کل سے......! لگتا ہے مرگ ہو گئی ہے گھر میں......پر تو چین سے بیٹھا رہ......"

"ماں جی میں......"

"تو چین سے بیٹھا رہ......! تجھے کچھ نہیں ہونے لگا......! تو جیئے گا جیسے سارے لفنگے جیتے ہیں۔ اوئے تجھے کیا پرواہ؟ کبھی چھوٹے بھائی کا سوچا ہے؟ کل کو وہ بھی تیرے نقش قدم پر چلے گا......"

"ماں جی میں......"

"وہ بھی تیرے نقش قدم پر چلے گا، اس کے اندر بھی تو وہی خون ہے!"

"ماں جی میں جان بوجھ کے فیل نہیں ہوا!"

"تو بونگا ہے......؟! تجھے عقل نہیں......؟! اس بار کیا بہانہ ہے کونسا استاد چھٹی پر چلا گیا تھا......! کیا کسر چھوڑی تیرے باپ نے تم دونوں کے پیچھے......؟ کیا صلہ دیا تو نے اس کی محنت کا......؟ کس منہ سے وہ کالج جا کر دوسروں کے بچوں کو پڑھائے۔ اپنے کو تو پڑھا نہیں سکا۔ تو نے جیتے جی مار دیا اسے۔ وہ استعفیٰ دینے لگا ہے، سنا تو نے......؟! وہ استعفیٰ دینے لگا ہے۔ کہتا ہے وہ اس

قابل نہیں ہے کہ کسی کو پڑھا سکے۔ چار حرف پڑھے ہوتے تو پاس بھی نہ ہوتا......؟!
تیرے یاروں میں سے کتنے فیل ہوئے ہیں......؟ بول، کتنی شان سے تو انھیں بتاتا
ہے کہ ایک تو ہی نکما ہے۔ کیا کہتا ہے تو اپنے آپ کو......؟ عالمگیر......! ساری
دنیا پاس ہوگئی پر ایک تو رہ گیا......! تیرے باپ نے ساری عمر محنت کر کے ایک
مقام بنایا، پر تو نے مٹی میں رول دی ہر چیز......! جان کے فیل نہیں ہوا......؟
سارے شوق تو نے پورے کیئے۔ کرکٹ کھیلی، شکار کھیلا، ویلیاں ماریں، سارے چاؤ
تو نے پورے کیئے، صرف اس لئے کہ تجھے پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا رہا......؟ تو نے
کبھی بھوک نہیں دیکھی......! سن لے میری بات! ہم مر بھی گئے ناں تو تجھے حرام کی
پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملنے لگی......! ہم اپنا سب کچھ کسی یتیم کے نام کر کے مر جائیں
گے پر تجھے حرام خوری نہیں کرنے دیں گے......"

"کھٹاک" کی آواز کے ساتھ رابطہ منقطع ہو گیا۔

بابر نے ریسیور رکھا اور گم سم ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ گھر خالی تھا، اور غسلخانے
میں لگی کپڑے دھونے والی مشین کی آواز سکوت کو مزید گہرا بنا رہی تھی۔

"ماں جی میری کس نے سنی ہے"، اس نے اپنے ہاتھوں کی لکیریں دیکھیں۔

"میں آپ سے کیا کہوں کہ ساری عمر ابو کے ڈنڈے کی وجہ سے نہیں
پڑھا۔ آپ لوگ اتنے سچے ہیں کہ آپ دوسرے کی بات کو سچ مان ہی نہیں سکتے۔ میں
کون ہوں......؟ میں کیا ہوں......؟ بچپن سے لے کر اب تک ابو سے نمبروں
کی اہمیت سنتا آیا ہوں اور کسی چیز کی نہیں۔ امی، میرے لئے نمبروں نے اپنی اہمیت کھو
دی......! کیا فائدہ ان نمبروں کا جنھوں نے مجھے کبھی خوشی بھی نہیں دلائی؟ ہمیشہ میں
غلام ہی رہا ان نمبروں کا......! میں نے غلط کیا، پر میں نے کونسا فیصلہ ہوش کے
ساتھ کیا؟ میں نے کونسی آپ کی کمائی کھائی؟ کن لوگوں سے آپ میرا مقابلہ کر رہی
ہیں۔ پر میری کس نے سنی ہے؟ کسی نے بھی نہیں"

"طاہر سنے گا تو ہنسے گا!"، وہ بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مسکرایا، "کہے گا یہ کیا

بکواس ہے، اور وہ بھی بابر تیرے منہ سے، کیونکہ یہ چیز کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ہزار
یاریاں نبھانے کے بعد بھی میں اکیلا ہوں۔ جن لوگوں سے میں ملتا ہوں وہ مجھ جیسے
نہیں، جو مجھے کرنا چاہئے تھا میں نے کیا نہیں، پر کیا کروں بچپن سے جو چیز جیسی تھی
ویسی ہی ہوتی چلی گئی، میں نے کوئی نیاء کام نہیں کیا۔ بچپن میں غلامی کا طوق جو آپ
نے پہنایا وہ آج اس طرح ٹوٹا ہے......! پر یہ سب میں نے کس کو کہنا ہے، کس سے
سننا ہے؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"بہرحال ایک غلط فہمی ہے آپ کو۔ آپ کو کیا سب کو ہے! آپ سب یہی
سوچتے ہیں کہ میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ میرا مقصد ہے۔ اب میرا مقصد ہے۔
آپ لوگوں کے بغیر جی کر دکھانا، اور میں جی کر دکھاؤں گا۔ میں اب گھر واپس نہیں
جاؤں گا۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ دو چار دن باہر پھروں گا پھر واپس آ جاؤں گا گھر۔ کوئی
نہ کوئی راستہ نکل آئے گا اور ایک اور بے کار اپنے ماں باپ کے پیسے بیٹھ کر کھائے گا مگر
ایسا نہیں ہوگا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے ایک نکما پیدا کیا ہے۔ نہیں، آپ نے ایک
عالمگیر پیدا کیا ہے۔ میں عالمگیر تھا، ہوں، اور رہوں گا۔ میں ڈسنے کے لیے پیدا نہیں
ہوا۔ میں مٹی میں ملنے کے لیے تیار ہوں، پر میں دھبہ نہیں بنوں گا۔ کبھی نہیں!

فریدا خاک نہ نندیئے! خاک جیڈ نہ کوء
جیوندیاں پیراں تلے، مویاں اپر ہوء

"تماشہ دیکھنے والو......!" وہ اپنے محلے داروں، رشتہ داروں، چغل خور
یاروں کے بارے میں سوچتا ہوا بولا، "اور جو مرضی ہو سو ہو لیکن وہ نہیں ہوگا جو تم سوچتے
ہو، چاہے مجھے مٹی میں ملنا پڑے۔"

بیٹھک میں سے جب وہ نکلا تو خالہ دھلے ہوئے کپڑے تار پر ڈال رہی
تھی۔

"کیوں پھر؟" خالہ حمیدہ نے کپڑے تار پر پھیلاتے ہوئے کہا "بات ہوگئی ماں سے؟"

"ہاں جی"

"اچھا"

"خالہ جی میں اب جا رہا ہوں ذرا کام ہے"

"اچھا ٹھیک ہے گھر جائے گا تو اپنی ماں سے کہنا کہ کمیٹی کے پیسے دینے والے ہیں"

"اچھا جی"

"تیرا رزلٹ آ گیا ہے؟"

"ابھی نہیں خالہ جی۔ میں اب چلتا ہوں"

کپڑے تار پر ڈال کر خالہ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے مڑی، "چاہے جتنی بھی جلدی ہو پتر، تو اب داتا کی نگری میں آیا ہوا ہے۔ پہلے جا کے داتا صاحب سلام کر، پھر کام پر جا، انشاءاللہ بہتر ہوگا۔ ٹھہر ایک منٹ....." اتنا کہہ کر خالہ انگیٹھی پر سے کچھ پیسے اٹھا لائی، "یہ لے سو روپے، میری طرف سے صدقہ دے آنا"

جب اس نے گھر سے قدم باہر رکھا، تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے سر سے چھت اٹھ گئی ہو۔ اس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ آسمان کی نیلی وسعتوں میں سورج آگ برسا رہا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے وہ مین روڈ تک آیا اور ویگن میں سوار ہو گیا۔

ویگن کی کھڑکی میں سے جب اسے داتا دربار کے بلند مینار نظر آئے تو اس نے دل میں عقیدت کے ساتھ درود شریف پڑھا، اور زیر لب دعائے خیر مانگی۔ سٹینڈ پر اتر کر وہ عوام کے ایک سمندر میں ڈوب گیا، جو بغیر سمت کے ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہجوم میں سے رستہ بناتے ہوئے وہ دربار کی طرف بڑھنے لگا۔ دوپہر کی گرمی عروج پر تھی اور لو چل رہی تھی۔ اس کے باوجود ہر طرف عقیدت مندوں، مسافروں اور زائرین کا بے پناہ رش تھا۔ گھنے بازاروں میں گلاب، ہری چادریں اور کھانے بک رہے تھے اور فٹ پاتھ پر نگینوں سے لے کر دواؤں تک طرح طرح کے ٹوٹکے فروخت کیئے جا رہے تھے۔

دربار کے سامنے جب وہ جوتیوں کے سٹینڈ کے پاس پہنچا تو یک لخت جھٹکا کھا کر رک گیا۔ بائیں طرف دربار کی دیوار میں بنی محراب میں سے سنی جہاد کونسل کا بورڈ جھانک رہا تھا۔ اک خواب کے عالم میں وہ سیڑھیاں اترا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ دربار کے ساتھ ملحقہ بازار میں مڑا۔ آٹھ دس دکانیں چھوڑ کر پھول پتیاں بیچنے والی ایک دکان کے اوپر وہ بورڈ لگا تھا۔ سوئے ہوئے قدموں پر چلتے ہوئے

وہ اس طرف بڑھنے لگا۔

"یہ اوپر جانے کا راستہ کس طرف سے ہے؟"

"پیچھے سے سیڑھیاں جاتی ہیں"، دکاندار نے پھول سجاتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

دکان کے ساتھ اندھیرے برآمدے میں سے ہوکر، کچی اینٹوں کی سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ اوپر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک بے سروسامان کمرے میں فرش پر بچھی دری پر دو آدمی گرمی سے بے سدھ پڑے تھے۔ ان کے اوپر گھومنے والا پنکھا ہوا کی بجائے شور زیادہ پیدا کر رہا تھا۔ چند ساعت تک وہ انہیں یوں گھورتا رہا جیسے انسانوں کی بجائے بھوت پریت دیکھ رہا ہو۔

دونوں باریش تھے اور ان میں بس ایک ہی چیز یکساں تھی۔ پانی کے کولر کے گرد بازو ڈالے ہوئے آدمی نے فوجی یونیفارم زیب تن کر رکھی تھی، جو اس قدر میلی تھی کہ نقلی لگ رہی تھی۔ اس کے لمبے بال کمزور صحت اور پچکے ہوئے گال کہیں سے بھی فوجی سختی کا پتہ نہ دے رہے تھے۔ ساتھ لیٹا ہوا دوسرا آدمی سادہ شلوار قمیص میں ملبوس تھا اور قمیص میں سے ابھری اس کی گنبد نما توند، فوجی کی ہڈیوں کے مقابلے میں خاصی خوشگوار لگ رہی تھی۔

بابر نے آہستہ سے دو تین بار دروازہ کھٹکھٹایا، پر ان کی نیند پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر اس نے دروازہ کھڑکایا اور دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"اسلام علیکم" اس کی خشک سی آواز نکلی۔

"وعلیکم اسلام" دونوں اٹھ کر بیٹھے، "آؤ جی آؤ، بیٹھو"

بابر جوتیاں اتار کر ان کے سامنے دری پر بیٹھ گیا۔ تب اس نے دیکھا کہ کونے میں ایک کمسن لڑکا بھی لیٹا تھا، جو ان کے ساتھ ہی بیدار ہوا تھا۔

اسے اپنا حلق خشک محسوس ہونے لگا۔

"جہاد پر جانے کے بارے میں کچھ معلومات چاہئیں"۔

"آپ جانا چاہتے ہیں؟" موٹے آدمی نے داڑھی کھجاتے ہوئے پوچھا۔

"جی"

"آپ کا شناختی کارڈ بنا ہے؟"

بابر کو لگا جیسے اس کے معدے میں سے اٹھتی شکست کی لہر سے اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔

"میں اپنے ملک وقوم کی خاطر، اور اپنے کشمیری بھائیوں کی خاطر جان کی بازی لگانے کو تیار ہوں"، اس نے کہا۔

موٹے نے کچھ سمجھتے ہوئے تائید میں سر ہلا دیا۔

"اس طرح ہے کہ ہمیں آپ کی دو تصویریں چاہییے ہوں گی سو دو سو روپیہ رجسٹریشن فیس اور ایک ذمہ دار اور بالغ آدمی کی طرف سے دستخط شدہ تحریری اجازت نامہ درکار ہوگا"

"کس قسم کی تحریر؟"

"بس کاغذ پہ لکھ دے کہ .... کہ ...... آ آ"، موٹا اپنا ذہن استعمال کرنے کی تکلیف سے کراہنے لگا، "کہ آہ! بس کہ یہ جا رہا ہے، اور میں اسے جانے دے رہا ہوں اور یہ اپنی مرضی سے جا رہا ہے، اور باقی اسی کی مرضی ہے وغیرہ وغیرہ"، اتنے میں ہی اس کا سانس پھول گیا، "بیٹا ندیم نیچے جا کر چائے کا کہہ آؤ" وہ لڑکے سے مخاطب ہوا، "آپ چائے پیو گے؟"، اس نے بابر سے پوچھا۔

"نہیں جی شکریہ....... اور کچھ؟"

"بس یہی ہے، ساتھ میں دو جوڑے کپڑے اور جوتی لے آئیں"

"کب؟"

"یہاں سے قافلے ہر ماہ کی یکم اور پندرہ تاریخ کو چلتے ہیں، آپ ان کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں"

"کس وقت؟"

اس دھیمے سوال نے موٹے کو پوری طرح متوجہ کر لیا۔

"صبح فجر کی نماز کے بعد"، وہ بابر کو غور سے دیکھنے لگا۔

بابر نے تائید میں سر ہلا دیا۔ اس کے ہر سوال کا جواب انگاروں سے اس کے ذہن کی سلیٹ پر لکھا جا رہا تھا۔

"لیکن جانے سے کم از کم دو تین دن پہلے آپ کو نام رجسٹر کروانا پڑے گا"

"آگے پھر کیا ہوگا؟"

"یہاں سے آپ کو مظفر آباد لے جایا جائے گا، جہاں آپ کو بنیادی عسکری تربیت دی جائے گی۔ یہ ایک ماہ کا کورس ہوتا ہے جو کہ کوئی بھی کر سکتا ہے، چاہے جہاد پر جائے یا نہ جائے، لیکن وہ شخص مجاہد نہیں کہلائے گا۔ یہ کورس کرنے کے بعد آپ کو وادی میں اتارا جائے گا، جہاں آپ مجاہدین کے ساتھ شامل ہوں گے، اور جہاد کریں گے، ایک سال کے بعد، اگر آپ واپس جانا چاہیں، تو آپ غازی بن کر واپس جا سکیں گے"۔

"یہ" فوجی نے دیوار کے ساتھ لگے پرچوں کے ڈھیر میں سے ایک پرچہ اٹھا کر اسے دیا "یہ ہمارے جاں نثاروں کی گذشتہ ایک سال کی کارکردگی کی رپورٹ ہے"

بابر نے وہ پرچہ لے لیا۔

اتنے میں لڑکا چائے لے کر آ گیا۔

"آپ چائے لو"

"بہت شکریہ، میں اب چلتا ہوں"

سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے بیک وقت سرد و گرم کا احساس ہوا، اور وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

گلی میں اتر کر وہ ایک ایک بات احتیاط سے اپنے ذہن میں دہرانے لگا۔

پندرہ تاریخ۔

آج نو تاریخ تھی، جس کا مطلب تھا کہ ابھی چھ دن باقی تھے۔

دو سو روپیہ۔

نہیں سو یا دو سو روپیہ، یعنی کہ سو روپے سے کام چل سکتا تھا۔ اس وقت جیب میں پورے دو سو روپے پڑے تھے۔ سو روپیہ ماں جی نے دیا تھا، سو روپیہ خالہ نے۔

دو تصویریں۔

تصویریں اقبال فوٹو سٹوڈیو سے اتروائی جا سکتی تھیں، تصویر کھنچوانے کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن تنویر کو کم از کم نیگیٹو کے پیسے دینے پڑنے تھے۔ خیر، کوئی بات نہیں، یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

دستخط شدہ تحریر۔

کوئی چکر نہیں، کسی سے بھی لکھوائی جا سکتی تھی۔

یعنی کہ مسئلہ حل۔

نہیں دو مسئلے، ایک تو کپڑوں کا ایک اور جوڑا۔ پرانا جوڑا واپس جا کر خالہ کی طرف سے اٹھایا جا سکتا تھا مگر باقی دن کہاں گزارے جائیں؟ کپڑوں کا جوڑا تو طاہر سے بھی مل سکتا تھا، لیکن چھ دن؟

سوچ بچار کرتے ہوئے وہ مین روڈ تک آ گیا، اور آہستہ آہستہ دربار کی طرف چلنے لگا۔

"چھ دن تو بہت زیادہ ہیں" اس نے سوچا، "کسی دوست کا چوبارہ! نہیں، اگر محلے میں واپس گیا اور گھر نہ گیا تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔"

"یار میرا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا؟ میں چلا گیا تو پیچھے امی ابو کا کیا حال ہو گا؟"، ایک اور سوچ ابھری۔

پھر اسے اپنی ماں کی باتیں یاد آ گئیں۔

"نہیں امی میں ایسا نہیں ہوں.......! جانے سے پہلے امی ابو کے نام خط لکھ دوں گا، تاکہ وہ زیادہ پریشان نہ ہوں مگر اب گھر واپس جانے کا تو سوال ہی نہیں

پیدا ہوتا!" وہ سوچنے لگا۔

اتنے دن پھر کہاں گزارے جائیں؟

"زندگی اگر اتنی سکھی ہوتی تو اور چاہیے کیا تھا؟ یہیں دربار پہ رہوں گا اور کیا۔ جہاں اتنے اللہ والے اللہ کے ولی کے دربار میں رہتے ہیں، وہاں مجھے بھی پناہ مل جائے گی"۔

"اور کھانا بھی یہاں سے؟"

"اونہیں یار"، اس کی انا نے جوش مارا "میں بھیک منگوں کی طرح لڑ لڑ کر چاول نہیں کھا سکتا، اپنی جھولی میں ڈال کے! یہاں کہیں کام مل جائے گا"۔

"یہاں کس قسم کا کام مل سکتا ہے؟" وہ بازار میں نظریں دوڑاتے ہوئے گھوما اور اچانک اس نے جیسے کرنٹ کا جھٹکا کھایا۔

کسی کا ہاتھ اس کی جیب میں تھا۔

اسکے ساتھ کھڑے دبلے پتلے لڑکے نے ایک [illegible] سے اپنی بند مٹھی بابر کی جیب میں سے نکالی۔ بابر کی جیب ادھڑتی چلی گئی۔ لڑکے نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا اور بھاگ اٹھا۔

"چور! چور!"، بابر پنجوں سے ہوا میں خراشیں ڈالتے ہوئے زمین پر گرا۔

"چور!"

جیب تراش قلانچیں بھرتا ہوا ڈبل روڈ کے بیچ میں پہنچا۔ ایک تیز رفتار ٹرک کے آگے سے چھلانگ لگاتے ہوئے وہ روڈ کے بیچ بنی گرین بیلٹ پر چڑھ گیا۔

ٹرک کی بریکیں چنگھاڑیں اور اٹھ کر بابر اسکے پیچھے بھاگا۔

ٹرک کے پیچھے گاڑیوں کے ہارن بجے، گاڑیاں سڑک پر جلے ہوئے ربڑ کے نشانات چھوڑتی ہوئیں ٹرک کے پیچھے رکنے لگیں۔

چور بھاگتے ہوئے دوسری سڑک پر مخالف سمت میں جانے والی ٹریفک کے بیچ میں کود گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے دوسری سڑک بھی پار کر کے فٹ پاتھ پر

چڑھ کر اندھا دھند بھاگنے لگا۔

بابر اسکے پیچھے چھلانگ لگا کر گرین بیلٹ پر چڑھا۔ دوسری طرف سڑک پر کودنا تیز رفتار موت کے آگے کودنے کے مترادف تھا۔ بابر گرین بیلٹ پر اندھا دھند بھاگنے لگا۔

"چور! چور! چور!"، گرین بیلٹ پر لگے پودے پھلانگتے ہوئے بابر پوری قوت سے چلاّنے لگا مگر دوطرفہ ٹریفک کے شور میں اس کی آواز کسی کے کان نہ پڑی۔

جیب کترا انتہائی مہارت سے پیدل چلنے والوں کو دائیں بائیں جھکائیاں دیتے ہوئے بھاگا جا رہا تھا۔ گرین بیلٹ پر بھاگتے ہوئے بابر اسے اپنی نظروں میں رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

ٹریفک سگنل بند ہوا اور بابر بھاگ کر دوسری سڑک بھی پار کر گیا۔

"چور! چور! چور!"

چور اب بھی اس سے بہت آگے تھا مگر خون جگر جلاتے ہوئے بابر اسقدر تیز دوڑا کہ اسکے اور جیب تراش کے درمیان فاصلہ بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔

بہت سے راہگیر اس سے ٹکرائے۔ کسی کے ہاتھ سے سامان چھوٹ کر سڑک پر گرا۔ کوئی گھوم کر سڑک پر جا پڑا، اور کوئی کہنی پر آئی چوٹ کو ملتے ہوئے گالیاں دیتا رہ گیا مگر بابر پرواہ کیئے بغیر اپنے اور جیب تراش کے درمیان فاصلہ کم کرتا چلا گیا۔

بھاگتے بھاگتے چور کی رفتار ٹوٹنے لگی اور وہ ہانپنے لگا۔ لڑکھڑاتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔ بابر رش کو چیرتے ہوئے ہر سیکنڈ اسکے قریب تر ہوا جا رہا تھا۔

چور نے آخری زور لگا کر ایک بار پھر گاڑیوں کے درمیانی فاصلوں میں پھرتی سے دوڑتے ہوئے سڑک کراس کی اور دونوں سڑکوں کے بیچ گرین بیلٹ پر چھلانگ لگا کر چڑھ گیا۔

بابر بھی اسکے پیچھے گاڑیوں سے بچتا ہوا سڑک پار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"چور! چور!"، گاڑیوں سے بچتے ہوئے اس نے پیدل چلنے والوں پہ دھیان نہیں دیا اور وہ سڑک پار کرتی ایک عورت اور اس کی بچی سے اسقدر زور سے ٹکرایا کہ تینوں سڑک پر جا گرے۔

چور نے گرین بیلٹ پر سے چھلانگ لگائی اور دوسری سڑک پر مخالف سمت میں جاتی ٹریفک کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ واپس آنے لگا۔

عورت چیخنے لگی۔

بابر اٹھ کر چور کے پیچھے بھاگا اور ایک پولیس والے نے دوڑ کر اس کی گردن دبوچ لی۔

"ٹھہر جا کتے!"، پولیس والا ڈنڈا بلند کرتے ہوئے دھاڑا۔

چور دوسری طرف فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ اب وہ دونوں سڑکوں کے پار بابر کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھا۔

"وہ......وہ......وہ"، بابر گریبان چھڑاتے ہوئے بھاگنے لگا۔

چور ایک ہاتھ پسلیوں پر رکھے، ڈبل روڈ کے اس پار بھیڑ میں ایک بار پھر غائب ہونے لگا۔

"ٹھہر جا تیری تو......"، پولیس والے نے بابر کی گردن کے گرد بازو ڈالتے ہوئے اسے گرا لیا۔

عورت ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ گرم سڑک پر اس کا پورا بازو رگڑا گیا تھا اور اس کی بچی سڑک پر بے ہوش پڑی تھی۔

"مجھے جانے دے!"، بابر اپنی گردن کے گرد پولیس والے کا بازو کھولتے ہوئے چلایا، "وہ چور ہے! وہ چور ہے!! وہ چور ہے!!!"

"وہ چور ہے؟!"۔ چور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

"وہ چور ہے؟!"، پولیس والا بابر کی گردن پر پورا زور ڈالتے ہوئے ہانپا،

"ادھر دیکھ سپاہی تو نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے!"

بابر یکلخت پلٹی کھا کر پولیس والے کے جسم کو اپنے نیچے لایا۔ اس نے پولیس والے کے بازو میں دانت گاڑ دیئے۔

پولیس والا چیخا، اس نے اپنا ڈنڈا گھما کر پوری قوت سے بابر کے سر میں مارا۔

بابر وہیں ڈھیلا پڑ گیا۔

پولیس والا گالیاں بکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کے گرد ایک مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ عورت اپنی بچی کو سنبھالتے ہوئے بابر کو سہمی سہمی نظروں سے دیکھنے لگی۔

پولیس والے نے گالیاں بکتے ہوئے بابر کو ایک لات مارنی چاہی تو کسی نے اسے پیچھے سے کھینچ لیا۔

"چل بس کر اسمٰعیل، اس بیچارے کے ساتھ پہلے ہی زیادتی ہوئی ہے"، کوئی بولا۔

"زیادتی! اور جو زیادتی اس نے کی ہے! یہ میرا بازو دیکھ!"

کچھ آدمی بابر کو سہارا دینے لگے۔ کسی نے عورت کو سہارا دیا، اور وہ اپنی بچی سنبھالتے ہوئے ایک موٹر سائیکل سوار کے پیچھے بیٹھ کر ہسپتال چلی گئی۔

پولیس والا مسلسل گالیاں بکنے لگا۔

"چل بس کر یار اب......! جو زخمی ہوئی ہے اس نے کچھ نہیں کہا تو تو کیوں بول رہا ہے؟!"

"اس کتے کی تو میں تھانے جا کر چٹنی بناؤں گا!"

"چل رہنے دے اب چٹنی وٹنی، نہ تو اس چور کو بھاگنے دیتا، نہ یہ سب ہوتا!"

"کیا! کیا! کیا کہا تو نے؟!"

"مجھے آنکھیں نہ دکھا! منٹ سے پہلے تیری پیٹی اتروا دوں گا!"

"تو کہتا ہے میں نے اسے بھاگنے دیا ہے؟! میں اس وقت ادھر پیچھے کھڑا

تھا۔اس کی آوازیں سن کر میں آگے آیا ہوں، تو میں نے اسی کو دیکھا، کسی اور کو نہیں، اور
یہ عورت زخمی ہوئی، کیا میں اسے جانے دیتا......؟!"

"چلو جی جانے دو اب"، کئی لوگ بولے۔

"جو ہوا، بہت برا ہوا، رفع دفع کرو اب"

بابر سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور
بگڑی ہوئی سانسوں کے شور میں اسے کچھ سنائی نہ دیا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ کچھ لوگ
پولیس والے کو ایک طرف لے گئے۔ کسی نے بابر کو پانی کا گلاس لا کر دیا جو اس نے
لبوں سے لگا لیا۔

"بہت برا ہوا!"

"تیرا نام کیا ہے؟"

"کتنے پیسے تھے؟"

"چوری کیسے ہوئے؟"

"یہ پولیس والے منتھلی لیتے ہیں"

"ہاں جی کسے نہیں پتہ، وہ چور اس کے سامنے سے ہی گزرا ہے"

"بیچاری بچی کا سر پھٹ گیا"

"کوئی حال نہیں رہ گیا اس ملک کا"

"وہ پولیس والا اسے پکڑ سکتا تھا، پر اس نے جانے دیا"

جتنی زبانیں، اتنی باتیں۔ بابر کے حواس کچھ بحال ہوئے تو بھیڑ چھٹ گئی،
اور وہ خالی خالی نظروں سے روڈ کے اس پار گلی کو تکنے لگا جہاں چور غائب ہوا تھا۔ اس کا
دماغ سائیں سائیں کرنے لگا، اور جلتی ہوئی دھوپ میں اس پر بے ہوشی سی طاری
ہونے لگی۔ اسے اس دھوپ سے بچنے کے لیے چھاؤں چاہیے تھی۔ وہ لڑکھڑاتے
قدموں پر چلتے ہوئے واپس دربار کی طرف جانے لگا۔

راہ گیروں کی سرگوشیاں مکھیوں کی طرح اس کے کانوں میں بھنبھنانے لگیں اور وہ سر

جھٹکتے ہوئے آنکھوں کے آگے چھائے اندھیرے میں سے رستہ بنانے لگا۔

دربار پہنچ کر اس نے جوتیاں اتار کر ہاتھ میں پکڑیں اور ٹھنڈے فرش پر
ننگے پاؤں چلتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ وہاں کئی قسمت کے ستائے عارضی آشیانہ
بنائے بیٹھے تھے۔ اس نے بھی جوتیاں ایک کونے میں رکھیں اور ان پر سر رکھ کر سو
گیا۔

جہاں دکھوں کا بسیرا ہو، وہاں انسان کی اپنی تکلیف دوسروں کی کراہیں سن کر ہلکی پڑ جاتی ہے۔ اس برآمدے کی دیواروں کے ساتھ لاتعداد لوگ سہارا لئے بیٹھے تھے۔ ان میں کچھ وہ تھے جو باہر کی گرمی سے بچنے کے لئے سنگ مرمر کے ٹھنڈے فرش پر آ لیٹے تھے۔ کچھ ان میں مسافر تھے جو نیند کی حالت میں بھی اپنے سفری بیگ دبوچے ہوئے تھے۔ بہت سے ان میں سے بے سہارا، یتیم اور لاغر تھے، جنھیں سماج کے بے حس دیو نے سڑک پر تھوک دیا تھا اور وہ اپنوں سے پرائے ہو کر، اور پرائیوں کے لئے اچھوت بن کر یہاں آ پڑے تھے۔ بھدی عورتیں بوسیدہ پوٹلیاں پکڑے آنے جانے والوں کو خالی خالی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ ضائع شدہ نوجوان اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں کے پیچھے نہ جانے کیسے کیسے ویران سپنے دیکھ رہے تھے۔ بے حس و حرکت بوڑھے خستہ کپڑوں سے بدن ڈھانپے نہ زندہ ہونے کا پتہ دے رہے تھے، نہ مردہ لگ رہے تھے، اور ان سب کے بیچ میں سے خوش پوش، ہشاش بشاش، زندگی سے بھرپور خلقت دربار پر حاضری دینے کے لیے گزر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے امید و تشکر کا اک دریا نا امیدی اور یاس کے ساحلوں میں سے بہہ رہا تھا۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کی منتیں مرادیں پوری ہوئی تھیں اور وہ شکرانے کی دیگیں دینے آئے تھے۔ بہت سے ایسے تھے جنہوں نے نئے کاروبار شروع کیئے تھے اور وہ کامیابی کی منت ماننے آئے تھے۔ بہت سے بیٹوں کی پیدائش پر اترائے منت پوری کرنے آئے تھے، اور بہت سے بیٹوں کی خواہش دل میں لئے منت ماننے آئے تھے۔ غرضیکہ اس

ایک برآمدے میں، اس ایک جگہ پر انسانیت کے کھارے اور میٹھے پانی کے چشمے ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے۔

"ہاہاہا!!" ایک ننھا سا بچہ اسے چھیڑ کر بھاگا۔

بابر ایک گہری نیند میں سے تیرتے ہوئے بیدار ہوا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ اس کے بوجھل سر میں درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ منہ سے بہتی رال اسے سر کے نیچے رکھی جوتی میں ٹپکتی محسوس ہوئی۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے رال صاف کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ڈھلتے سورج کی کرنیں دربار کی دیواروں کو نارنجی مائل بنا رہی تھیں، اور برآمدے میں عوام کا رش عروج پر تھا۔

اس کے کانوں میں پھر کھسر پھسر کی آواز پڑی۔ قریب ہی تین بچے بڑی بڑی آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے۔

وہ مسکرایا اور بچے کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں مکھانوں کے پیکٹ تھے جو وہ بیچ رہے تھے۔ اس نے دیکھا دودھ کے دانت ٹوٹنے شروع ہو گئے تھے، جبکہ ان کا تیسرا ننھا سا ساتھی ان کے پیچھے کھڑا خوفزدہ سی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ان کے جسم پہ غربت کے مٹیالے رنگ کے لباس تھے اور سب سے بڑے بچے کی عمر شاید سات سال تھی۔

"بھائی مکھانے لے لے" ایک بچے نے شرماتے ہوئے، دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

وہ مسکرا دیا، "کتنے کا ہے؟"

"دس روپے کا، آٹھ روپے کے مکھانے ہیں، اور دو روپے ہمارا منافع"

"منافع! اپنا منافع کبھی کسی کو نہیں بتاتے۔ اچھا؟"

"بھائی لے لے"

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں"

"کیوں؟"

"میرے پیسے چوری ہو گئے"

وہ انگلیاں منہ میں دابے، ایک پاؤں سے دوسرا کھجاتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

بابر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بچے بھاگتے ہوئے کچھ دور جا کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ درد برداشت کرتے ہوئے اس نے گردن جھکا کر اپنے کپڑوں کا معائنہ کیا۔ سڑک پر گرنے سے قمیص دو ایک جگہ سے تھوڑی سی پھٹ گئی تھی اور جگہ جگہ مٹی اور شاید تیل کے داغ تھے۔ اسے پیاس محسوس ہونے لگی، اس نے جوتیاں اٹھائیں اور پانی کا کولر ڈھونڈنے چل دیا۔ پانی پی کر اس نے گیلے ہاتھوں سے قمیص صاف کی اور دربار سے باہر نکل آیا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ کاروبار زندگی چہل پہل کے ساتھ رواں دواں تھا۔

اس نے گردن گھمائی محراب میں سے سنّی جہاد کونسل کا بورڈ اب بھی جھانک رہا تھا۔ بورڈ پر ایک کبوتر آکر بیٹھ گیا۔ وہ بورڈ اسے خود سے اس قدر دور لگا جیسے اس تک پہنچنے کا فاصلہ صدیوں پر محیط تھا۔

اس کی جیب خالی تھی۔ البدر مجاہدین کا پرچہ تک وہ چور اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

جوتیاں ہاتھ میں پکڑے اسے سمجھ نہ آیا کہ زمین پہ انہیں کس سمت میں پھینکے۔ دائیں جانے والی گاڑیاں دائیں طرف جانے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ بائیں جانے والے لوگ بائیں طرف اشارہ کر رہے تھے۔ مینار پاکستان آسمان کی طرف اشارہ کر رہا تھا، اور خود اس میں قدم دربار سے اٹھا کر باہر رکھنے کی ہمت نہ تھی۔

"کیا یہ سزا ہے؟" اس نے سر اٹھاتے ہوئے آسمان پر نظر دوڑائی۔ کبوتروں کی ایک ڈار دربار کی چھت سے اڑ کر آسمان پر پرواز کرتی چلی گئی۔ ٹریفک کے شور میں کسی طرف سے بھی اس کے سوال کا جواب نہ آیا۔

اس نے آگے بڑھ کر جوتیاں زمین پر پھینکیں اور ان میں پاؤں ڈال کر چل دیا۔

"کام! کوئی کام ڈھونڈنا چاہئے"

"مگر مجھے کام کون دے گا؟"

اس نے ہر طرف نظر دوڑائی۔ سامنے ویگن سٹینڈ تھا۔ ایک طرف مینار پاکستان تھا، دوسری طرف بازار تھے۔ ہزاروں افراد میں سے ہر آدمی کسی نہ کسی مقصد کے تحت چل رہا تھا۔ اس کے سامنے بھی ایک راستہ تھا۔

"گھر؟"

بابر کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"اب اگر گھر کا نام لیا تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زبان کھینچ لوں گا! میں گھر نہیں جاؤں گا! میرا کوئی گھر نہیں ہے! میں آزاد ہوں!"

"پھر میں کیا کروں؟ مینار پاکستان سے چھلانگ لگا دوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں خود ہی اپنا گلا گھونٹ لوں گا"

"تیرا کیا خیال ہے؟ پروفیسر طفیل کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ ہے۔ کیا تو ابھی تک سمجھ نہیں پایا کہ تیرا اب کوئی نہیں؟ تو اکیلا ہے۔ تیرا کوئی گھر نہیں، کوئی اپنا نہیں، کوئی دوست نہیں۔ کیوں تو میری ہمت توڑ رہا ہے؟ ایک میں ہی تیرا دوست ہوں۔ میں ہی تیرا اپنا ہوں"

"یہاں کس قسم کا کام ڈھونڈوں؟"

"جس قسم کا بھی مل جائے"

"یہ تو ڈھونڈنے سے ہی پتہ چلے گا" اس نے سوچا، اور اللہ کا نام لے کر ایک طرف کو چل دیا۔

اس کے ہم عمر لڑکے انتہائی چابکدستی سے دربار پر آنے جانے والوں کے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے اور دیگیں چڑھانے والے گاہک گھیر رہے تھے۔

ظاہری بات ہے، اس نے سوچا، انھیں بیچ میں سے کمیشن بچتا ہوگا۔

"چلو پھر ایسا کرتا ہوں کہ گھوم پھر کر دیکھ لیتا ہوں کہ کہاں کہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"پھر اس کے بعد کیا میں دوسرا چکر لگاؤں ہر طرف کام کا پوچھنے کے لیے؟"

اس نے دیکھا کہ لڑکوں کے سینوں پر مختلف دیگ پکانے والوں کے بیج لگے تھے۔

"ان میں سے کسی سے کچھ کام کے بارے میں پوچھا جائے"، اس نے سوچا۔

بہت سے لڑکے دیگ والوں کے لیے گاہک گھیر رہے تھے۔ دربار کے ساتھ ہی ایک پورا بازار پکی پکائی چاولوں کی دیگیں بیچنے والوں پر مشتمل تھا۔ سب لڑکے ایک دوسرے سے واقف تھے، اور جب وہ گاہک نہ گھیر رہے ہوتے تو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر گپیں ہانکنے لگتے۔ بابر ان میں سے کسی سے بات کرنے کے لیے ہمت باندھنے لگا۔ ایک لڑکا باقیوں سے قدرے مختلف تھا۔ اس کی رنگت گوری تھی، بال سنورے ہوئے تھے اور کپڑے صاف ستھرے، استری کیے ہوئے تھے۔ وہ دوسروں سے کچھ فاصلے پر کھڑا منہ میں کچھ چبا رہا تھا۔ بابر اس کی طرف بڑھا۔

"بات سننا"

"ہاں جی؟"

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام"

"یار میں کچھ کام دھندا ڈھونڈ رہا تھا، اگر مل جائے تو......."

لڑکا آنکھیں سکیڑ کر اسے جانچنے لگا۔ منہ میں رکھی چیونگم اس نے زمین پر تھوک دی۔

"آپ غلط مت سمجھنا! میں کوئی نشہ وغیرہ نہیں کرتا! بس ضرورت مند ہوں

اور کوئی حق حلال کا کام......"

"دیگیں ڈھولو گے؟" لڑکے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیا؟...... ہاں جی! بالکل بالکل!"

"ہر دیگ ڈھونے پر دس روپے کمیشن ملے گا، اور رات کا کھانا فری۔ بولو منظور ہے؟"

"ہاں"

"آؤ [illegible]"

لڑکا اسے ساتھ ہی ملحقہ بازار میں لے گیا۔ ہر دکان میں پکتی دیگوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور بڑے بڑے تھالوں میں چاول چھانے جا رہے تھے۔ دونوں چلتے ہوئے دسویں دکان پہ آ کر رک گئے۔ دکان کے اوپر کرمانوالا باورچی کا بورڈ لگا تھا۔

"بلّے استاد!" لڑکا ایک بھاری جسامت کے آدمی سے مخاطب ہوا۔

"بول ملکو"

"نیا لڑکا لایا ہوں"

"اچھا" بلّے استاد نے پہلوانی نظر سے بابر کو جانچا، "کیوں بھئی تگڑا ہے؟ نشہ وشہ تو نہیں کرتا؟"

"نہیں جناب"

"کیا نہیں؟ تگڑا نہیں ہے یا نشہ نہیں کرتا؟" بلّا ہنس دیا، اور اس نے ایک بیج اٹھا کر بابر کی طرف اچھال دیا۔

"چل لگ جا کام پہ"

بابر نے جیسے ہی ہوا میں گھوم کر آتے بیج کو ہاتھ بلند کر کے پکڑا، بے اختیار اس نے منہ کھول کر جیسے ایک نئی زندگی کا سانس کھینچا۔ پیسے چوری ہونے سے اسکے دل پر کس قدر کاری ضرب لگی تھی اسے تب محسوس ہوا۔ جذبات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سیلاب

اس کے حواس پر چھا گیا اور وہ پلکیں جھپک کر آنسو زائل کرنے لگا۔
بیج کو اپنی مٹھی میں بند کرتے ہوئے وہ ملکو کے پیچھے چل دیا۔

اب تک وہ ایک بے جان اور بے حس خول اٹھائے پھر رہا تھا۔ ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی اسکے سر پر کوئی سایہ نہیں تھا۔ کھلے آسمان تلے وہ بے یارو مددگار تھا۔ اسکے سامنے ایک ہی راستہ تھا، کہ کشمیر چلا جاتا۔ اس چور نے وہ بھی چھین لیا تھا۔ مگر نہیں ......! وہ اب بھی جی سکتا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو کھولتے ہوئے وہ دل سے انکی قدر کرنے لگا، ان کو اپنا اثاثہ سمجھنے لگا۔ اسکے یہ دونوں ہاتھ ہی اب اس کا سہارا تھے، اسکے اپنے تھے۔ ان سے محنت کر کے وہ جی سکتا تھا۔ اسے اب اس دنیا سے ڈر کر کہیں بھاگنے کی ضرورت نہیں تھی۔

امید کی یہ ہلکی سی کرن دل کے اندھے تہ خانے میں جو چمکی تو بہت سے بھوت پریت اور جن ایک لمحے میں غائب ہو گئے جیسے کہ وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ اس کی ذات گھر کے صحن میں کھینچے ایک دائرے کی مانند تھی۔ یہ دائرہ ہی اس کی پوری زندگی تھی، اس کی سوچ کی حد تھی۔ اس دائرے کے باہر کی دنیا سے وہ ناآشنا تھا اور باہر کی دنیا انجانے ان دیکھے خطرات سے پُر تھی۔ پھر جب ابو نے اسے اس دائرے میں سے اٹھا کر باہر پھینک دیا تو وہ ان انجانے خون آشام درندوں کے بیچ آ گرا اور پھر جب امی نے بھی اس سے منہ موڑ لیا تو اس پر اندھیرے چھا گئے، جہاں وہ اکیلا تھا، ان ندیدہ بلاؤں کے ساتھ، جو اس کا خون پینے کے لیے بے چین تھیں۔

مگر اب .... یہ ہاتھ .... یہ پیر .... اسے بچانے کو آ گئے تھے۔
تشکر کے آنسو پیتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ مین روڈ تک پہنچ گیا۔

اسے ساتھ لانے والا لڑکا کچھ فاصلے پر کھڑا ایک نئی چیونگم چبا رہا تھا۔ بابر اس کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

"میرا نام بابر ہے"
لڑکے نے ٹیڑھی آنکھ سے اسے دیکھا اور پھر بولا "میرا نام یاسر ملک ہے"

"یہ کب سے...."
"دیکھ بھئی"، یاسر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا، "اور جو مرضی کرنا پر اپنی جھوٹی سچی رام کہانی نہ سنانا! اور نہ میری پوچھنا"
"میں کوئی رام کہانی نہیں سنانے لگا، صرف پوچھنے لگا تھا کہ دربار کب تک کھلا رہتا ہے"
"دربار تو کھلا ہی رہتا ہے پر دیگیں عشاء کی نماز تک دی جاتی ہیں"
"اور تم گاہک کو کہتے کیا ہو؟"
"بس یہی کہ صاحب غریبوں مسکینوں کو کھانا مل جائے گا، آپ کو دعائیں دیں گے نیکی کا کام ہے وغیرہ وغیرہ"
"اور..."
"یہ دیکھ"، اتنا کہہ کر یاسر دربار کی جانب بڑھتے ایک آدمی کی طرف دوڑا۔ اس آدمی نے شاید ابھی دیگ دینے کے بارے میں سوچا ہی تھا، کہ یاسر اسے تاڑ گیا اور جھٹ اس کے پاس جا پہنچا۔
"السلام علیکم جناب! دیگ دیں گے؟"
"آہاں......."
"نمکین چاولوں کی دیگ دو سو کی، اور میٹھے چاولوں کی ڈھائی سو کی اور مرغ پلاؤ کی پانچ سو کی، پر آپ میٹھے چاولوں کی دیگ دیں!" یاسر اسے کپڑوں سے جانچتے ہوئے بولا۔
"وہ کیوں؟"، متوسط درجے کا وہ آدمی کھل کر مسکرایا۔
"کیونکہ صاحب خوشی کا موقع ہے، اس لیے"
"تمہیں کیسے پتہ خوشی کا موقع ہے؟" اس نے گلنار ہوتے ہوئے پوچھا۔
"واہ صاحب چار ماہ سے یہاں کام کر رہا ہوں، کیا اتنا بھی نہ پتہ چلے گا کہ داتا کے پاس کوئی دل میں کیا لے کر آیا ہے؟"

"ہوشیار لڑکے ہو"، وہ آدمی ہنسا "چلو میٹھے چاولوں کی دیگ ہی سہی"

یاسر نے آناً فاناً اس سے ریٹ طے کیا اور ساتھ لے کر دکان کی طرف چل دیا۔

"چل آ!" اس نے بابر کو آواز دی اور بابر بھی اسکے ساتھ ہولیا۔ دکان پر پہنچ کر انہوں نے میٹھے چاولوں کی ایک تیار شدہ دیگ اٹھائی اور اسے لنگر خانے پہ لے گئے۔ وہاں اس آدمی نے پلیٹیں بھر بھر کر غریبوں کی جھولیاں چاولوں سے بھریں۔ دیگ خالی ہونے پر یاسر نے آدمی سے بقیہ پیسے لیے اور وہ خالی دیگ اٹھائے واپس بلّے استاد کی دکان پر لے گئے۔ بلّے نے اپنی کاپی میں بابر کے نام کا ایک کھاتہ کھولا اور اس میں دس روپے لکھ دیے اور پھر یاسر اور بابر واپس اپنی جگہ پر جا پہنچے۔

" کیوں زیادہ بھاری تو نہیں لگی؟" یاسر نے چوئنگم چباتے ہوئے بابر سے پوچھا۔

"نہیں"، بابر بولا۔

آج اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے ہاتھوں سے پیسے کمائے تھے اور اسے اک عجیب سی مسرت کا احساس ہونے لگا۔ اتنی سی محنت کے دس روپے......! اس طرح تو بہت سے پیسے کمائے جا سکتے تھے! محنت کرنا کس قدر آسان ہے اس نے سوچا، کام بندہ شروع کرتا ہے اور پھر وہ ختم ہو جاتا ہے۔ فارغ بیٹھنا کہیں زیادہ مشکل ہے یہ کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔

اس کے دل کا وہ گوشہ منور ہونے لگا تھا جو اب سے پہلے خالی اور ویران پڑا تھا۔

اس طرح باتیں کرتے کرتے شام ڈھلتی گئی۔ انہوں نے کئی گاہک تاڑے، کچھ ان کے ہاتھ لگے کچھ دوسروں کے۔ وہ بھاگتے ہوئے بلّے استاد کی دکان پر آتے، دیگ اٹھاتے اور لنگر خانے کی طرف لے جاتے۔ کچھ گاہک ایک دیگ دیتے، کچھ دو اور کچھ تین۔ اضافی دیگوں کے لیے وہ اور لڑکے اپنے ساتھ ملا لیتے، اور اسی طرح کام چلتا رہا۔

ایک نئی دنیا بابر کے سامنے کھلنے لگی۔ محنت کشوں کی دنیا، ریڑھے کرائے پر دینے والے، موٹر سائیکل رکشا چلانے والے، پھول پتیاں بیچنے والے، ان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ان لوگوں میں ایک اپنائیت سی تھی، ایک دوسرے کا احساس تھا جو معاشرے کے اوپر والے درجوں میں ناپید تھا۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے، دکھ سکھ بانٹتے ہوئے یہ لوگ مل جل کر زندگی گزار رہے تھے اور ان کی آپس کی دوستی پیسے والوں کی دوستی سے کہیں بڑھ کر تھی۔

سورج غروب ہو گیا۔ رات برقی روشنی سے منور ہو گئی، اور رات کے اندھیرے میں کاروبار کرنے والے منظر عام پر آ گئے۔ بابر کو یوں لگا کہ جیسے کسی نے گٹر کا ڈھکن اٹھا دیا ہو اور مختلف اقسام کے موذی کیڑے زمین پر رینگنے لگے ہوں۔

بازاری عورتیں سڑکوں پر نکل آئیں۔ دن بھر محنت سے پیسے کمانے والے لوگ بجائے اپنی کمائی گھر لیجانے کے ان کے پیچھے چل دیے۔ جرائم پیشہ افراد گِدھوں کی طرح کمزور اور آسان شکار ڈھونڈنے لگے۔ ویڈیو گیم اور بلیئرڈ کلبوں میں لڑکوں کا رش انتہا کو پہنچ گیا اور دھڑا دھڑ گیموں میں آج کی کمائی کے سکّے گرنے لگے۔

اندھیرے کونوں میں جُوا ہونے لگا، پتّے کھیلے جانے لگے، نشہ فروخت ہونے لگا اور چرس کی بدبو گلیوں میں پھیل گئی۔ ناک سکیڑتے ہوئے یہی بات بابر نے یاسر سے کی۔

"بس یار ایسے ہی ہے" یاسر بولا وہ شاید دسویں چوئنگم چبا رہا تھا"، پر ہمیں اس سے کیا؟ ہم اپنے دھندے پر ہیں وہ اپنے دھندے پر"

بابر نے نفرت سے تائید میں سر ہلایا۔ وہ نشے میں دھت ایک فقیر کو ادھر سے ادھر لڑھکتے ہوئے دیکھنے لگا۔

"یار مجھے بھوک بہت زور سے لگی ہے" وہ یاسر سے مخاطب ہوا۔

"بس ابھی کچھ ہی دیر میں اپنا لنگر کھل جائے گا۔ تیرے حساب سے کتنے

پیسے بن گئے ہیں اب تک؟"

"اسی روپے"، بابر اطمینان سے بولا۔

یاسر ہنس دیا" کیوں پھر؟ ٹھیک ہیں یا کم ہیں؟"

"ٹھیک ہیں یار"، بابر بولا"، بالکل ٹھیک ہیں"۔

"تو نے پھر بتایا نہیں تو کون ہے کہاں سے آیا ہے۔ شکل سے تو پڑھا لکھا لگتا ہے پھر ادھر کیسے؟"

بابر ہنس دیا"، تو نے خود ہی تو کہا تھا کہ اپنی جھوٹی سچی رام کہانی نہ سناؤں"

"وہ پہلے کی بات تھی"، یاسر نے چوینگم ایک طرف تھوکی اور وہ ایک راہ گیر کی چپل سے چپک گئی۔

"اب کی بات یہ ہے، یہ دیکھ نیا گاہک آیا ہے!"

"بڑی جلدی جلدی تاڑ رہا ہے بھئی!"، یہ کہہ کر دونوں اس سیٹھ کے پاس جا پہنچے، اس سے پہلے کہ دوسرے اس کے پاس پہنچتے۔

سیٹھ عرفان کے شاید دل کی مراد پوری ہوئی تھی۔ اس نے مرغ پلاؤ کی ایک دیگ کا آرڈر دیا۔ بلّے استاد نے جب دیگ کا ڈھکن اٹھا کر اس میں ڈوئی پھیری تو مرغ پلاؤ کی گرما گرم مہک سے بابر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ دوپہر سے بھوکا تھا اور جب ڈوئی پھیر کر بلّے استاد نے دیگ کا منہ ڈھکن سے بند کیا تو وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ بانسوں سے دیگ اٹھائے یاسر کے پیچھے چلتے ہوئے بابر کے کندھے دکھنے لگے، لیکن درد کے ساتھ ساتھ ایک عجیب تھکی تھکی سی خوشی کا احساس تھا، جس سے بابر کا سر بلند تھا۔

لنگر خانے کے چبوترے پر جب انہوں نے دیگ لا کر رکھی تو ایک نوجوان فقیر نے بابر کو ٹخنے سے پکڑ لیا اور اسے زور زور سے ہلانے لگا۔ بابر نے بمشکل خود کو گرنے سے بچایا۔

"ہٹ! ہٹ!" یاسر نے لپک کر بابر کا ٹخنہ فقیر کے ہاتھ سے چھڑوا کر اسے

زور سے دھکا دیا۔ فقیر "غیں غیں" کرتا ہوا پیچھے جا گرا۔

"ان سے دور رہ" یاسر بین کرتے ہوئے مجمعے کو نفرت سے دیکھتے ہوئے بولا "یہ سارے نشئی ہیں، ٹھڑے ہوئے ہیں۔ نشے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں اور بھوک سے ان کا دم نکلا جا رہا ہے۔ سارا دن سوئے رہتے ہیں حرامزادے اور اس وقت جاگ کر لنگر خانے پر آ کر ٹوٹ پڑتے ہیں، ان سے بچ کر رہنا!"

سیٹھ عرفان بھی منہ کھولے ہراساں سی نظروں سے ان بدکار اور بدبخت انسان نما مکوڑوں کے ہجوم کو دیکھنے لگا۔ ان کی آنکھوں میں دیوانگی کی چمک تھی اور بھوک اور نشے کی طلب کی شدت سے ان میں سے وحشت اور خباثت پھوٹ رہی تھی۔ ان کے منہ کھلے تھے، غلیظ دانتوں میں سے جھاگ چھوٹ رہی تھی اور حلق میں سے ایسی کریہہ اور ہیبت ناک آوازیں نکل رہی تھیں جیسے زندگی میں ہی ان پر جہنم کے دروازے کھل گئے ہوں۔ دھکم پیل کرتے، اپنی غلیظ جھولیاں پھیلائے وہ دیگ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔

"صاحب جی شروع کریں"، یاسر نے نفرت سے کہا۔ سیٹھ عرفان نے جھرجھری سی لی اور یاسر نے دیگ کا منہ کھول دیا۔ سیٹھ عرفان نے جھک کر مرغ پلاؤ کی ایک پلیٹ بھری اور بین کرتی ہوئی ایک عورت کی جھولی میں انڈیل دی۔ گوشت دیکھتے ہی وہ پاگل ہو گئے اور کتوں کی طرح اس عورت پر پل پڑے۔ عورت چیختی ہوئی ان کے بیچ گر پڑی اور کانپتے ہاتھوں نے اس کی چادر کے چیتھڑے چیتھڑے کر دیئے۔ چاول اچھل کر زمین پر گرے۔ مرغ کی بوٹیاں پیروں تلے روندی گئیں اور وہ گھٹنوں پر گر کر گوشت بھنبھوڑنے لگے۔

"چھوڑ دیو!" یاسر چلّاتے ہوئے ان کے سروں میں مکے مارنے لگا۔

عورت زمین پر بکھرے چاولوں پر لیٹ گئی اور اپنے جسم سے چاولوں کو چھپاتے ہوئے دانتوں سے بوٹیاں بھنبھوڑنے لگی۔

ان میں سے کچھ سیدھے ہونے لگے۔

"صاحب جی!" یاسر چلّایا، "جلدی کریں!"

سیٹھ عرفان نے ایک اور پلیٹ بھری اور ایک کشکول میں انڈیل دی۔

ندیدوں کی طرح سب اس پر پل پڑے یہ فقیر کچھ تگڑا تھا وہ دوسروں سے لڑ پڑا۔ سیٹھ عرفان نے ایک اور پلیٹ بھری اور ایک اور جھولی میں انڈیل دی۔ اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چلنے لگے کیونکہ ان کی دائمی بھوک کی غراہٹیں سن کر اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ یاسر چلّا چلّا کر انھیں علیحدہ کرنے لگا، اور بابر سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔

درندگی کے اس منظر کو بہت سے لوگوں نے دیکھا اور وہ حیرت اور نفرت کے عالم میں ایک دوسرے کو اشارے سے دکھانے لگے۔

بالآخر دیگ خالی ہوگئی اور سیٹھ عرفان کانپتی ہوئی ٹانگوں پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"صاحب جی بقیہ پیسے؟!" یاسر بولا اور سیٹھ عرفان چونک کر حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بقیہ پیسے نکالے اور گنے بغیر یاسر کو تھما دیئے۔ فقیر کونوں میں لگ کر جلدی جلدی چاول نگلنے لگے، اور کچھ فرش پر گری ہوئی بوٹیاں تلاش کرنے لگے۔

"چل بھئی"، یاسر بابر سے مخاطب ہوا۔ اس نے پلیٹ دیگ میں پھینک کر دیگ ڈھانک دی۔

بابر نے دیوار کے ساتھ لگے بانس اٹھائے اور پھر وہ رک گیا۔ یاسر نے دیکھا کہ وہ گردن موڑے برآمدے کے اس پار دیکھ رہا تھا۔

بابر نے آہستہ سے بانس دیوار کے ساتھ واپس لگا دیئے اور وہ پھسلتے ہوئے زمین پر آ گرے۔

"اوئے بابر......! کیا کر رہا ہے......؟" یاسر بولا۔

بابر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔

"اے اوئے!!" یاسر ہاتھ ہلاتے ہوئے چلّایا۔

بابر کی نظریں برآمدے کے اس پار سڑک کے کنارے کھڑے سگریٹ پیتے ہوئے دبلے پتلے لڑکے پر گڑی تھیں۔ وہ ثابت قدموں پر چلتے ہوئے برآمدہ پار کرنے لگا۔ اسے بالکل جلدی نہیں تھی، کیونکہ اسے یقین تھا، بلکہ کامل یقین تھا کہ وہ لڑکا وہاں سے ہلنے والا نہیں تھا۔ وہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے دو تین لڑکوں کے ساتھ گپیں ہانک رہا تھا۔ بابر نے دیکھا ایک ہاتھ اس نے کولہے پر رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ کچھ بات کر رہا تھا۔ اس کی انگلیوں میں پکڑے سگریٹ سے اٹھتا دھواں اس ہاتھ کی ہر حرکت کے گرد مرغولے کھا رہا تھا، اور جب اس نے سگریٹ لبوں سے لگا کر کش کھینچا تو تمباکو کے اس انگارے کے سامنے بابر کے لیے تمام روشنیاں ماند پڑ گئیں۔

"ہاہا! او آہو یار کل وی ایہی ہویا سی"، وہ اپنے کسی دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا "میں سی، دیما سی، بی سی، اسی سارے کل 'جٹی دا کھڑاک' ویکھن گئے سی۔ پہلوان جی پچھو نہ! صائمہ رانی اے سکرین دی!"

"اچھا؟!"

"باوا جی اودھے اگے ہور کوئی کھلو نہیں سکدی! میں تے بالکل......!" بابر نے اس کے بازو پہ ہاتھ مارا۔

لڑکے نے مڑ کر اسے دیکھا، اور اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کے تاثرات ابھر آئے۔

"میرے پیسے!"، بابر سلگتی ہوئی سانسوں میں بولا۔

"کی گل اے اوئے؟" جیب تراش کا دوست اسے گھورتے ہوئے بولا، پر بابر نے اسے دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔

احساسِ جرم جیب تراش کی آنکھوں میں صاف لکھا تھا اور بابر کی نگاہ حق اس پر تھی۔

"میرے پیسے!"، وہ غرّایا۔

جیب تراش نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ایک قدم پیچھے کو ہولیا۔ بابر نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

" کی مسئلہ اے بھئی تیرے نال؟!" اس کا دوست بابر کو للکارتے ہوئے آگے بڑھا۔

اچانک جیب تراش کو احساس ہوا کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے دو دوست اس کے ساتھ تھے اور وہ سنبھل گیا۔

" کونسے پیسے؟" اس کی کمزور سی آواز نکلی " کونسے پیسے؟!" وہ اپنا بازو چھڑوا کر کھنکھارا۔

"وہی جو تو نے چرائے ہیں"، بابر پھنکارا۔

"میں نے کوئی پیسے نہیں چرائے"۔

"میرے پیسے نکال!"

"اوئے تو بہت بکواس کرنے لگ گیا ہے!" اسکے دوست نے بابر کی قمیص کا کالر مٹھی میں جکڑ لیا۔

"میرے پاس کوئی پیسے نہیں اور نہ ہی میں نے چرائے ہیں!" چور دلیر ہو کر بولا۔

"پیسے نک...... آل!!!"، بابر اپنا کالر چھڑاتے ہوئے دھاڑا۔

"میں کہ........"، چور بولا۔

"تیری تو......! پوری قوت سے اس کے دوست نے بابر کو تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

بابر نے گھوم کر بائیں بازو سے اس کا ہاتھ روکتے ہوئے دائیں ہاتھ کا ایک مکّہ پوری قوت سے اس کی ناک پر مارا۔ مکّے کی زبردست چوٹ سے ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ دوسرا مکّہ اس نے گھما کر جیب تراش کے بوکھلائے ہوئے دوسرے دوست کی ناک پر دے مارا۔ اس کی نکسیر پھوٹ گئی، دونوں دوست لڑکھڑاتے ہوئے زمین پر

جا گرے۔ بابر نے جیب تراش کو گریبان سے پکڑ لیا۔

"پیسے نکال!"

"مم..... مم.... آ آ آ!!!" بابر نے ایک زوردار تھپڑ چور کے منہ پر جڑ دیا۔ وہی ہاتھ اس نے واپس پوری قوت سے گھمایا اور "تھپاڑ!" کی آواز سے الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے دوسرے گال پر جڑ دیا۔ چور گم صم ہو کر لڑکھڑانے لگا۔ بابر نے گریبان سے پکڑ کر اسے سہارا دیا۔ اس کے اپنے ہاتھ میں تکلیف کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

"میرے پیسے نکال" بابر اسے جھنجھوڑتے ہوئے چلایا، مگر چور کے حواس گم تھے۔

بابر کی اپنی سانس پھولنے لگی۔ بہت سے آدمی بھاگتے ہوئے اس طرف کو آنے لگے۔

" کیا ہو گیا ہے بھئی؟"

"اوئے اصغر لینڈے ہناں نوں مار پے رہی اے!" پیچھے کہیں کسی نے کسی کو آواز دی۔

"اصغر!"

" نہیں چھڈاں گے!"

"او بھائی!" ایک آدمی نے بابر کو شانے سے پکڑا، "او بھائی! تو نکل جا یہاں سے! بڑا خون خرابہ ہو جائے گا، یہ بدمعاش ہیں یہاں کے ......!" مگر بابر نے بدستور چور کو پکڑے رکھا۔ اس نے ہاتھ بدل کر ایک زناٹے دار تھپڑ چور کے گال پر جڑ دیا۔ چور خون تھوکنے لگا۔

"اوئے لینڈے نوں مار ریا ای!!!"

"اصغر! اصغر کتھے ای؟!"

"اصغر دا نک پن دتا اے!"

"ایدی پہن نوں.......!!"

بابر نے جھولتے ہوئے دیکھا کئی لڑکے اس کی طرف دوڑے چلے آ رہے

تھے۔اس نے لینڈے چور کو دھکا دیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

"او پھڑو اینوں!"

"کدھر جار ہا ہے؟"

"ویکھو اوئے!!"

بابر بھیڑ میں سے تیزی سے نکلتا گیا۔مین روڈ پر بھاگنا خطرے سے خالی نہ تھا، بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی کہ گلیوں میں وہ گم ہو جاتا۔

وہ تیزی سے اس گلی میں نکل گیا جس میں سنی جہاد کونسل کا دفتر تھا۔اس کے پیچھے چیخ و پکار مزید بڑھ گئی۔ بھاگتے ہوئے وہ ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔گلی میں آنے جانے والے لوگ اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگے، اسے پتہ تھا کہ جہاں جہاں وہ جائے گا لوگ پیچھے آنے والوں کو اس کی نشاندہی کرتے جائیں گے۔

ایک سائیکل والے کو جھکائی دیتے ہوئے وہ دائیں مڑ گیا، آگے جا کر وہ بائیں مڑ گیا پھر بائیں پھر دائیں۔ تنگ گلیاں، گندی نالیاں، گند میں دانہ چگتی مرغیاں، مٹی میں بنٹے کھیلنے والے بچے، پھر بھی وہ بھاگتا چلا گیا، اور جب اسے لگا کہ اب اس کا دل سینہ پھاڑ کر کسی نالی میں جا گرے گا تب وہ رک کر ایک دیوار کے ساتھ سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا، ہاتھ بری طرح درد کرنے لگا اور وہ یوں ہانپنے لگا کہ شاید ہانپتے ہانپتے اس کی روح پرواز کر جاتی۔اس نے اپنا دایاں ہاتھ دیکھا۔انگوٹھے اور انگشت شہادت کے ٹوٹے ہوئے ناخنوں میں سے خون بہہ رہا تھا۔پورے ہاتھ میں سنسناہٹ سی پھیلی ہوئی تھی۔اس نے خیال کیا کہ شاید کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہو، پر ہاتھ سلامت تھا۔

"سالے کتے کے بچے!" وہ ہانپتے ہوئے سوچنے لگا، "ان تین کو تو میں اکیلا ہی دیکھ لیتا! اگر میرا ایک بھی یار ساتھ ہوتا تو........"

ایک دم اسے یاسر کا خیال آیا، "لعنت! یاسر کیا سوچ رہا ہوگا؟"

"اس نے میرا ساتھ ہی نہیں دیا"

"اسے کیا پتہ تھا کہ میں باہر جا کر کسی کا سر پھوڑ دوں گا!"

"اب ادھر تو نہیں جا سکتا!"

"نہیں جا سکتا" میرے پیسے!"

"اچھا دھویا چور کے بچوں کو!"

"سالے چور! ہائے!"

وہ بازاروں کو چھوڑ کر کسی رہائشی علاقے کی طرف آنکلا تھا۔انتہائی گنجان آبادی تھی۔وہ ایک لمبی سی گلی میں ستا رہا تھا، اور گلی شیطان کی آنت کی طرح دونوں سمتوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔واپس جانا مشکل تھا لہٰذا وہ آگے بڑھنے لگا۔

اندھیرا پھیل گیا۔مکانوں کے دروازوں کے اوپر جلنے والے بلبوں کے علاوہ کوئی روشنی نہ تھی۔کہیں کہیں سے گانے بجنے کی آواز آنے لگی اور بابر کے ذہن میں صرف ایک ہی لفظ کلبلانے لگا، "بھوک!"

بھوک سے اس کی ہر حس چاق و چوبند تھی، اندھیرے میں اس کے قدم کسی شکاری جانور کی طرح پڑنے لگے۔اس نے سوچا کہ کسی بازار کی طرف نکلنا چاہئے۔ہاتھ بالکل سن ہو چکا تھا اور اسے ٹانگ کے ساتھ لگاتے ہوئے اس نے قدم تیز کر دیئے۔

گلی میں سے گلیاں نکلنے لگیں۔کچھ ویران، سنسان اور کچھ نقل و حرکت کا پتہ دینے لگیں۔وہ داتا دربار کے پیچھے بنی آبادیوں میں نکل آیا تھا۔اگر وہ اپنے دائیں طرف جاتا تو بلال گنج کی طرف نکل جاتا۔اگر بائیں جاتا تو آبادیوں میں مزید گھستا چلا جاتا۔وہ بائیں مڑ گیا کیونکہ اس طرف کی گلیاں کم سنسان تھیں۔اس کا ارادہ گلیوں میں سے چکر کاٹ کر واپس مین روڈ پر نکلنے کا تھا۔کچھ دور چل کر وہ پھر بائیں ہاتھ ہو لیا اور ناک کی سیدھ میں چلنے لگا۔ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی جس میں کہیں کہیں ٹی وی چلنے کی آواز سنائی دے جاتی۔

آہستہ آہستہ چہل پہل کے آثار نمودار ہونے لگے۔اِکا دُکا سائیکلیں، شاید وہ لوگ جو کام سے واپس آ رہے تھے، نکڑوں میں کھڑے نوجوان، اس نے دیکھا،،

گھروں کے بیچ میں ایک چھوٹے سے قد کے آدمی نے جنرل سٹور کھولا ہوا تھا۔ وہ اس سٹور کی طرف بڑھ گیا۔ سٹور میں ایک زرد رنگ کا بلب روشنی کر رہا تھا۔

"پانی ملے جائے گا؟" اس کے حلق سے ایک گھمبیر سی آواز نکلی۔

دکاندار نے اسے دیکھا، اور پھر ایک طرف رکھے کولر میں سے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس بھر کر اسے پکڑا دیا۔

اس نے گلاس لبوں سے لگالیا۔

کاؤنٹر پر مختلف قسم کے پلاسٹک کے ڈبے تھے جن میں گولیاں ٹافیاں تھیں اور دیوار پر کیلوں سے شاپر بیگ لٹک رہے تھے جو چپس اور بند وغیرہ سے بھرے تھے۔

"ایک بند دینا" اس نے کہا۔

دکاندار نے ایک بند نکال کر اسے پکڑا دیا۔ اس نے لفافہ پھاڑا اور بند نکال کر کھانے لگا۔

"ایک گلاس پانی"، لفافہ گول مول کر کے پھینکتے ہوئے اس نے کہا۔

دکاندار نے اسے گلاس بھر دیا۔ گلاس خالی کر کے اس نے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"شکریہ"

"پیسے؟!"

اس نے بات کرنے سے پہلے اپنا دایاں ہاتھ ایک پلاسٹک کے ڈبے پر رکھا۔ دکاندار کی نظر خون سے لتھڑی انگلیوں پر پڑی اور وہ ایک قدم پیچھے ہو گیا۔

"پیسے نہیں ہیں"، بابر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور چل دیا۔ بند کھانے سے بھوک مزید بھڑک اٹھی مگر پانی نے کم از کم معدہ بھر دیا۔ اسے بے چینی سی ہونے لگی، اور احساس ہوا کہ یہ بے چینی رات پڑ جانے کی وجہ سے تھی۔ دن کا اجالا ختم ہو چکا تھا، دن کا کاروبار ختم ہو چکا تھا۔ دن میں ہر شئے واضح تھی، ہر صورت شفاف تھی اور دن میں شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اب رات پڑ چکی تھی اور اندھیروں

میں وہم چھپے تھے، شکلیں واضح نہ تھیں اور نیتوں پر پردے تھے۔ رات میں بے اعتباری تھی جس سے بچنے کے لیے ٹھوس دیواروں اور سر پر چھت کی ضرورت تھی۔

"میں اندھیروں سے کیوں ڈروں؟" اس نے سوچا "رات میں بھی بہت سے کام ہیں۔ ابھی تو شام ڈھلی ہے۔ ابھی بہت وقت ہے کچھ کرنے کے لیے، اور کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی!"

اک کائنات کا بوجھ اٹھائے، دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے وہ چل دیا۔

اب مین روڈ قریب تھی کیونکہ گلی ایک بازار کی شکل اختیار کرنے لگی۔ دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے، مگر بیچ بیچ میں بہت سی دکانیں کھلی تھیں۔ کپڑوں کی دکانوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور ویڈیو سینٹروں میں گانے خوب دھوم دھمکے سے چل رہے تھے۔

"یہ کونسا ایریا ہے؟" اس نے راہ چلتے ایک لڑکے کو روک کر پوچھا۔

"یہ تیرہ نمبر گلی ہے"۔

"یہاں سے مین کتنی دور ہے؟"

"آگے جا کر چوک سے دائیں ہاتھ ہولیں، سامنے مین ہے"۔

اس نے سر ہلایا، اور چلتے چلتے اپنے گرد بغور جائزہ لینے لگا۔ یہاں بہت سے پان سگریٹ کے کھوکھے تھے۔ "ان میں سے کسی پہ جا کر بات کی جائے، پر کیا فائدہ؟" اس نے سوچا۔

تھوڑا آگے چل کر اسے دو ایک ہوٹل نظر آئے جن کے باہر میز کرسیاں لگی تھیں اور لوگ تکّے کباب کھا رہے تھے۔ بہت سے ویٹر ان میں آگے پیچھے بھاگے پھر رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے گزر گیا۔ چوک میں پہنچ کر وہ دائیں ہاتھ ہولیا۔ یہ زیادہ بھرا پرا بازار تھا اور یہاں لوگوں کی آمدورفت زیادہ تھی۔

"اس پورے علاقے میں نشہ کرنے والے بہت ہیں"، اس نے سیڑھیوں میں ایک بیہوش پڑے نشہ باز کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"اس کی جیبیں دیکھنی چاہئیں"، اس کے دل میں خیال آیا اور وہ ہنس دیا۔ راہ چلنے والوں نے اسے حیرت سے دیکھا پر وہ بے پرواہی سے ہنستا چلا گیا۔

"توبہ ہے یار"، اس نے سوچا، اور آگے بڑھ گیا۔

کچھ آگے جا کر دونوں طرف سنوکر اور ویڈیو گیموں کی دکانیں تھیں۔ وہ ایک دکان کے اندر بے اختیار کھنچا چلا گیا۔ وہاں ایک طرف سنوکر کی میز لگی تھی اور دوسری طرف گیمیں تھیں۔

وہ گیمیں دیکھنے لگا۔ وہاں "سٹریٹ فائیٹر" تھی، مگر اس کا وہ حصہ تھا جس میں گولے ہی گولے نکلتے جاتے تھے۔ یہ پارٹ اسے ناپسند تھا، کیونکہ اس میں گیمیں تھیں اور یہ صرف چھوٹے بچوں کے کھیلنے کے قابل تھا۔ اس کے ساتھ "سنو بروز" لگی تھی، اور اگر اس کے پاس ایک بھی ٹوکن ہوتا تو اس نے گیم کا اینڈ کر دینا تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ آگے "میٹل سلگ" تھی۔ بمشکل گیموں سے الگ ہو کر وہ دوسری طرف آیا۔ یہاں چار لڑکے سنوکر کھیل رہے تھے اور ایک ٹیم دوسری کو سینتالیس پوائنٹ کی لیڈ دے رہی تھی۔ لڑکے کھیل میں محو تھے۔ پانچ پانچ سو کی شرط لگی تھی۔ بابر بھی کھڑا ہو کر گیم دیکھنے لگا۔ دو ایک بار اس نے دونوں ٹیموں کو مشورے بھی دیئے۔ اس نے کوشش کی کہ کچھ ان لڑکوں سے علیک سلیک ہو جائے، مگر اتنی جلدی اعتبار کہاں پیدا ہوتا ہے۔ گیم کا فیصلہ ہونے پر اگلی گیم لگ گئی۔ اس بار دو دو سو کی شرطیں رکھی گئیں اور پھر بابر کو احساس ہوا کہ ان لڑکوں نے گیمیں کھیل کر گھر چلے جانا ہے مگر اس کے پاس جانے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس وقت اسے آصف ماموں کا کلب یاد آیا، اور وہ خیال جھٹکتے ہوئے دکان سے باہر آ گیا۔ سامنے ہی ایک تپلی سی گلی کا منہ دو دکانوں کے بیچ میں کھل رہا تھا۔ وہ سڑک پار کر کے اس گلی میں ہولیا۔

گلی اس قدر تپلی تھی کہ سامنے سے آتے ایک سائیکل سوار کو رستہ دینے کے لیے اسے دیوار کے ساتھ لگنا پڑا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اوپر آسمان بالکل ایک سیاہی مائل لکیر کی طرح نظر آیا۔ کچھ آگے جا کر گلی تھوڑی سی کھل گئی۔ اس کے دائیں ہاتھ پر

ایک کھلا ہوا دروازہ تھا جس کے آگے پردہ پڑا تھا۔ اندر سے وی سی آر پر فلم چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

اس نے پردہ اٹھا کر اندر جھانکا۔ اندر بلا کا حبس تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس کی چھت اس قدر نیچی تھی کہ اس میں سیدھا کھڑا نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ تینوں طرف دیواریں تھیں جن میں کوئی روشندان تک نہ تھا۔ کمرے میں روشنی صرف ایک انگیٹھی پر پڑا پرانا ٹی وی سیٹ کر رہا تھا، جس پر ایک برباد پرنٹ والی پاکستانی فلم چل رہی تھی، باقی کمرا اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ ننگے فرش پر ایک پرانی دری بچھی تھی جس کے مسلسل استعمال سے ریشے ادھڑ گئے تھے۔ دری پر پندرہ بیس لڑکے لیٹے فلم دیکھ رہے تھے۔

بابر کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کیا یہ لوگ پاگل تھے؟ جنونی تھے؟ ایسا بھی کیا شوق کہ اس بدبو میں، اس حبس میں، اس وحشت زدہ ماحول میں وہ لوگ لیٹے فلم دیکھ رہے تھے! کمرے میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ دروازے کے ساتھ ہی اس ذلت کدے کا مالک ایک کرسی پر چھڑی پکڑے بیٹھا تھا۔

"ہاں بھئی"، وہ چھڑی سہلاتے ہوئے بولا۔

بابر خاموشی سے اسے تکنے لگا۔

"اک شو پنج روپے دا، دس روپے وچ اک شو فری"

بابر نے نفرت سے پردہ گرا دیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر لمبے سانس لینے لگا۔

کمرے میں سے اٹھتا تعفن کسی جانور کی جگہ سے اٹھتی بدبو سے بدتر تھا۔

وہ آگے چل دیا۔ اسی قسم کا ایک اور دروازہ بائیں جانب آیا مگر وہ اس کے آگے سے تیزی سے گزر گیا۔ آگے چل کر گلی ایک بازار میں مل رہی تھی۔ بابر نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

گلی کے منہ پہ ایک لڑکا بجلی کے کھمبے کے ساتھ پیر ٹکائے کھڑا تھا۔ اس نے بابر کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا، بابر نے اسے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں، بابر نے اس سے آنکھیں پھیر لیں۔ جیسے ہی اس نے بازار میں قدم رکھا اس لڑکے نے پیچھے

سے آواز دی۔

" کدھر جناب جی؟"

بابر ٹھٹھک کر رک گیا۔

" کہیں بھی نہیں"، بابر نے مڑ کر جواب دیا۔

" کچھ ڈھونڈ رہے ہو؟" وہ بابر کا ہم عمر تھا، مگر قد میں چھوٹا اور بابر سے کہیں زیادہ تجربہ کار لگ رہا تھا۔

" نہیں کچھ بھی نہیں" بابر کی نظر اس کی قمیص کی بھری ہوئی جیب پر پڑی جس پر وہ ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

"اندر پھر کیا لینے گئے تھے؟" وہ اپنی آنکھ دباتے ہوئے بھرپور انداز میں مسکرایا۔ اس کی ناک چپٹی تھی، چہرہ گول اور چھوٹے چھوٹے تیکھے بال چینی نژاد تھے۔

"تم سے مطلب؟!" بابر نے تیز لہجے میں کہا۔

"اوہو آپ تو ناراض ہو رہے ہو!" اس لڑکے نے قدرے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"تم سوال ہی ایسے کر رہے ہو"

"اچھا خیر چھوڑو۔ آپ یہاں نئے لگ رہے ہو" لڑکے نے پینترا بدلا۔

بابر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جانے ہی لگا تھا کہ وہ لڑکا پھر بول پڑا۔

"میرا نام چھیکو ہے اور میں ادھر سپلائی دیتا ہوں۔ آپ اچھے لگے اس لیئے آپ سے بات کر لی"۔

"میرا نام بابر ہے"، بابر رک گیا، "معاف کرنا یار میں تم سے ذرا اوکھا ہو کر بولا تھا"

وہ لڑکا ہنس دیا، " کوئی بات نہیں جی کوئی بات نہیں آج کا زمانہ ہی ایسا ہے"

بابر نے تائید میں سر ہلا دیا۔

" آپ یہاں نئے آئے ہو؟"

"ہاں"

"اچھا اچھا۔ میں بھی کہوں پہلے آپ کو کبھی دیکھا نہیں اِدھر"

"تم کیا کرتے ہو؟"

"میں جی باڈی بلڈنگ کے کیپسول سپلائی کرتا ہوں"

بابر ہنس دیا اور اس کے ذہن میں چھائے شبہات مٹ گئے۔ " چھوڑو یار کیوں بیوقوف لڑکوں کو لوٹتے ہو"

"وہ کیسے جی؟ میں ادھر ہر جم میں سپلائی دیتا ہوں" اس لڑکے نے آگے آتے ہوئے کہا۔

"لوکل کیپسول ہیں؟"

"ہاں جی"

"یا تو بالکل ہی بیکار ہوں گے یا بہت خطرناک۔ یہ کام چھوڑ دو جس دن کوئی لڑکا مر گیا ناں اس دن ٹنگے جاؤ گے"

"اور کیا کریں جناب؟ جو لیتے ہیں انھی کو دیتے ہیں۔ کوئی اپنی مرضی کے خلاف پیسے تھوڑی خرچتا ہے۔ اب یہ نہ کریں تو اور کیا کریں؟" چھیکو نے آنکھوں میں تکلیف زدہ تاثرات لاتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی ہے"

" آپ کیا کرتے ہو؟" چھیکو نے ایک خاص انداز میں سوال کیا۔

"میں یار.........."، بابر نے کندھے اچکا دیئے۔

"اچھا ابھی فارغ ہو۔ ابھی امتحان دیئے ہوں گے۔ میرے بھی کئی دوستوں نے امتحان دیئے ہیں مگر سارے فیل ہو گئے۔ کوئی کوئی پاس ہوا ہے" چھیکو نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"چھیکو میں کوئی کام شام ڈھونڈتا پھر رہا تھا یار!" بابر کندھے اچکاتے ہوئے مسکرایا۔

" کیسا کام جناب؟" چھیکو نے قدرے اعتماد کے ساتھ پوچھا۔

"بس یار کوئی بھی کام، جس سے دو وقت کی روٹی مل جائے اور تھوڑا بہت پیسہ"

چھیکو سر جھکا کر فلمی انداز میں سوچنے لگا۔

" کیا سوچ رہے ہو؟" بابر نے تذبذب کے عالم میں پوچھا۔

" کچھ نہیں۔ بس یہ کہ یہاں ہر لڑکے کا یہی خواب ہوتا ہے"

" کیوں؟ کیا یہاں کام نہیں ملتا؟"

"ملتا ہے جناب" چھیکو ہنس دیا، "پر کرتا کون ہے۔ یہاں سب سوچتے سوچتے ختم ہو جاتے ہیں"۔

بابر نے تائید میں سر ہلا دیا، "پر یار کچھ تو کرنا ہے "اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح اس لڑکے سے کوئی کام نکلوا لے۔

"جناب یہاں اچھی نوکری تو آپ کو مل نہیں سکتی" چھیکو مسکرایا۔

"نوکری کی کون بات کر رہا ہے یار۔ میں کہہ رہا ہوں کوئی کام مل جائے"

" کس قسم کا کام"

" کوئی بھی یار۔ بس کام ہو، دیہاڑی لگنی چاہیے"

چھیکو سوچنے لگا، "میں راجہ باڈی بلڈنگ کلب کے لیے کام کرتا ہوں۔ انھی کے لیے کیپسول سپلائی کرتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر صاحب ہیں، ڈاکٹر صابر صاحب، انھیں ایک اچھا پڑھا لکھا لڑکا چاہیے کمپونڈری کے لیے، جو دوائیاں وغیرہ سنبھال سکے"۔

"ہاں ہاں!" بابر کا دل بلّیوں اچھلنے لگا "میں یہ کام کر سکتا ہوں"

"اچھی بات ہے جی" چھیکو نے بے فکری سے کہا۔

"چھیکو یار تم میرے لئے فرشتہ بن کر آئے ہو اور دیکھو میں تمھارے ساتھ کیسا سلوک کر رہا ہوں!"

" کوئی نہیں جی" چھیکو ہنسا " آپ بھی تو میرے لئے لوشن بن کر آئے ہو۔ میں آپ کو ڈاکٹر صاحب سے ملوا دیتا ہوں۔ باقی ان کی مرضی، رکھیں نہ رکھیں"۔

" ٹھیک ہے" بابر نے بالکل ہی ہتھیار ڈال دیئے۔

" آپ کل پھر......"

"یار آج سے..... میرا مطلب ہم ابھی ڈاکٹر صاحب سے نہیں مل سکتے؟"

چھیکو معنی خیز انداز میں مسکرایا، "ابھی؟ ابھی ڈاکٹر صاحب کلینک پہ بیٹھے ہوں گے۔ ہم وہاں جا تو سکتے ہیں پر......"

"ہاں ہاں چلو پھر!"

" چلیں پھر؟"

" چلو! ڈاکٹر صاحب کا کلینک کِدھر ہے؟"

وہ چل دیئے۔ بابر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ زندگی ایک جنگ تھی، اسے اب سمجھ آ رہا تھا، جس میں حوصلہ سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ جن میں حوصلہ نہ تھا وہ نشے میں خود کو بھول کر اپنے ہی خوابوں کی دلدل میں دھنستے جا رہے تھے، مگر اس میں حوصلہ تھا، برداشت تھی، جی اٹھنے کی امنگ تھی، لہذا جو اسے تھوڑی بہت انگریزی آتی تھی اسکے الفاظ یاد کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر صاحب کے انٹرویو کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ یہ نوکری اسے چاہیے تھی، ہر قیمت پہ چاہیے تھی۔ رات بھوکا سو کر گزاری جا سکتی تھی، اس میں کوئی مسئلہ نہ تھا، مگر کل اسے ہر صورت میں نوکری چاہیے تھی۔ کپونڈر کی تنخواہ کم از کم دو تین ہزار روپے تو ہوتی ہو گی، وہ سوچنے لگا، پانچ سو، ہزار روپے ڈاکٹر صاحب سے شروع میں مانگے جا سکتے تھے۔

"میں کام ہی اتنے اچھے طریقے، اتنی محنت سے کروں گا کہ ڈاکٹر صاحب خوش ہو جائیں گے، پھر ان سے دو تین دن بعد پیسے مانگ لوں گا، کچھ تو دیں گے ہی، پھر چھ دن بعد کشمیر!.... بائی بائی!!" اس کے حوصلے مزید بلند ہو گئے، اور قدم خود بخود تیز ہونے لگے یہاں تک کہ چھیکو کو بھاگ بھاگ کر اسے پکڑنا پڑ رہا تھا۔

"بھائی جی تھوڑا آہستہ چلو!" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"اوہ! اچھا" بابر ہنسا۔

"آپ کو تو پر ہی لگ گئے ہیں"

"پر ہونے چاہئیں یار پروں سے ہی بندہ اڑ سکتا ہے"

"واہ، آپ تو بڑی بڑی باتیں کرتے ہو"

بابر ہنس دیا، "آگے پیچھے تو کبھی نہیں، لیکن آج کرنے کو دل کر رہا ہے"

"اچھی بات ہے۔ یہاں کوئی ایسی باتیں نہیں کرتا"

"وہ کیوں؟"

"پتہ نہیں"

"یار یہ ڈاکٹر صاحب کس قسم کے بندے ہیں؟"

"میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ بڑا ٹھیک ٹھاک کام چلتا ہے ان کا، بڑی دور دور سے لوگ آتے ہیں ان سے علاج کروانے کے لیے"

"کس چیز کے ڈاکٹر ہیں وہ؟"

"کیا؟ اب پتہ نہیں"، چھیکو نے کندھے اچکائے۔

"اب سے پہلے کون کمپونڈری کرتا تھا ان کے لیے؟"

چھیکو نے اسے کوئی جواب نہ دیا، وہ ایک پی سی او کے آگے آ کر رک گیا۔

"میں ایک فون کر لوں؟" اس نے بابر سے پوچھا۔

"ہاں ہاں" بابر نے کہا، اس کی سوچوں کا دھاگہ ٹوٹ گیا، "کر لو کر لو"

چھیکو پی سی او کے اندر چلا گیا اور بابر سڑک کے کنارے اس کا انتظار کرنے لگا۔

پی سی او کے ساتھ ہی ایک برگر والا ریڑھی لگائے کھڑا تھا۔ بابر اس سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا، اتنا دور کہ اسے تلتے ہوئے کبابوں کی خوشبو نہ آ سکے۔

"صبر یار صبر" اس نے خود کو تلقین کی۔ اس نے سوچا کہ چھیکو سے پیسے مانگ

لے، پر نہیں، یہ کیا کم تھا کہ وہ اسے نوکری دلوا رہا تھا۔

پانچ منٹ بعد چھیکو پی سی او سے باہر آ گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"چلیں؟" اسے نے بابر سے پوچھا۔

"چلو"

چھیکو کا چہرہ کھل اٹھا تھا اور وہ چلتے چلتے مستیاں کرنے لگا۔

بابر ہنس دیا" کیا بات ہے بھئی۔ کس سے بات کر کے آئے ہو، بہت خوش لگ رہے ہو"

"بس صاحب جی" وہ کھل کر مسکراتے ہوئے بولا" اپنا مسئلہ حل ہو گیا آج ٹھیک ٹھاک لوشن لگے گا!"

"کونسہ مسئلہ؟ اور یار مجھے صاحب نہ کہو، میرا نام بابر ہے"

چھیکو ہنس دیا، "بابر" وہ بولا "اچھا نام ہے"

بابر نے اسے قدرے حیرت سے دیکھا" میں نے تمھیں اپنا نام بتایا تو تھا"

"میرے ذہن میں نہیں رہا ہوگا۔ اچھا جناب، اوہ! بابر تمھاری نوکری پکی!"

"کیا؟!"

"ہاں، ابھی ٹائم کیا ہوا ہے؟"

"ٹائم؟ ٹائم پتہ نہیں"

"پونے آٹھ" چھیکو نے ایک دکان کے اندر جھانکتے ہوئے کہا، "چلو آؤ"

اس بار چھیکو تیز چلنے لگا اور بابر اس کے ساتھ ہو لیا۔ چھیکو اسے ایک سمت میں لے جانے لگا۔ بابر کے لیے یہ سب بھول بھلیاں تھیں، مگر رستوں سے زیادہ وہ اپنی قسمت پر حیران ہو رہا تھا۔ دو ایک دفعہ اس نے چھیکو سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی، مگر چھیکو نے اسے گول مول سا جواب دے کر چپ کرا دیا۔

"ابھی ہم وہاں پہنچ جائیں گے" چھیکو ہنسا" پھر آپ خود دیکھ لینا"

کچھ دیر بعد وہ ایک رہائشی علاقے میں آ پہنچے۔ چھیکو نے راہ چلتے ایک آدمی

کو روک کر اس سے ماچس مانگی۔

"بھائی جی ٹائم کیا ہوا ہے؟" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"ساڑھے آٹھ"

"بہت مہربانی"

"یہ تم بار بار ٹائم کیوں پوچھ رہے ہو؟" بابر نے چلتے ہوئے اسے پوچھا۔

"اس لیئے کہ یہ اپنا لوشن لگنے کا ٹائم ہے" چھیکو نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور بابر کو لینڈا چور یاد آگیا۔

دونوں چلتے چلتے ایک گلی میں آنکلے جس کے ساتھ ایک بڑا سا خالی پلاٹ تھا۔

"یار ڈاکٹر صاحب کا کلینک کدھر ہے؟"

"بس اب تھوڑا ہی دور ہے"

"مجھے یہاں آنا پڑا کرے گا؟"

"کیا؟ ہاں ہاں یہیں"

"کیا رات کو بھی یہاں رہنا پڑے گا؟"

"مجھے کیا پتہ" چھیکو اکتا کر بولا "پتہ نہیں"

سامنے سے ایک گاڑی گلی میں آنکلی۔ اس کی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں بابر کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ انہوں نے گاڑی کو گزرنے کے لئے رستہ دیا مگر گاڑی ان کے قریب آکر آہستہ ہوگئی۔ یہ سوزوکی آلٹو تھی اور اس میں چار آدمی بیٹھے تھے۔ گاڑی چلانے والے کی نظر چھیکو پر پڑی اور چھیکو ٹھٹھک کر رک گیا۔

"ابے اوئے....."

"بھاگ!!" چھیکو چلایا اور پلٹ کر بھاگ اٹھا، "بابر بھاگ!"

بابر کے طوطے اڑ گئے اور پھر اس نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے آدمی کو اپنی شلوار میں سے پستول کھینچتے ہوئے دیکھا، اور وہ بھاگ اٹھا۔

اس کے آگے چھیکو بڑے عجیب طریقے سے دوڑ رہا تھا اور پہلے چند قدموں میں ہی بابر کی اپنی تھکی ہوئی ٹانگیں دکھنے لگیں۔

گاڑی کے پہیئے چنگھاڑے اور یکدم بابر کو اپنا بھاگتا ہوا سایہ گاڑی کی دونوں لائٹوں کے بیچ میں نظر آیا۔ اس نے اچھل کر پلاٹ میں چھلانگ لگا دی۔ گاڑی اس کی ہوا کو چھوتے ہوئے نکل گئی پھر یکدم بریکیں لگنے کی آواز آئی۔

بابر کا پاؤں ایک اینٹ پر سے پھسلا اور وہ گھٹنے کے بل پلاٹ میں پڑی بجری پر جا گرا، وہ اٹھ کر بھاگا اور اسے اپنے پیچھے گاڑی کے دروازے بند ہونے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، شلوار قمیص میں ملبوس دو آدمی ہاتھوں میں موزر لئے اس کے پیچھے بھاگے آرہے تھے۔ وہ ڈر کے مارے مزید تیز بھاگا مگر سامنے ایک سپاٹ دیوار تھی اور کسی طرف نکلنے کا کوئی رستہ نہ تھا۔

"پولیس!!" اسے پیچھے سے آواز پڑی، "رک جا نہیں تو گولی مار دیں گے!"

دیوار اس سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر تھی، وہ ہار گیا۔

رک کر وہ مڑا اور دونوں آدمی اس پر چڑھ دوڑے۔ ایک نے اپنی پستول بلند کر کے دستے سے اس کے سر پر وار کیا، بابر نے جھکائی دی اور دستہ اس کے شانے سے ٹکرایا۔ اس کی چیخ نکلی اور وہ گر پڑا۔ دونوں آدمیوں نے جھک کر بے دردی سے اسے کھڑا کیا اور دونوں طرف سے اس کے بازو جکڑ لئے۔ اسے لیکر وہ گاڑی کی طرف چل پڑے۔ بابر کے قدم لڑکھڑائے۔ اس کے دائیں طرف والے نے دستے سے اس کے معدے پہ وار کیا، بابر کی کراہ نکل گئی۔

"سیدھی طرح چل" دائیں طرف والا غرایا۔

بابر گرتا پڑتا گاڑی تک آپہنچا جہاں دو آدمی چھیکو کو لئے کھڑے تھے۔ چھیکو ادھموا لگ رہا تھا اور اس کے گال پر گہرے سرخ رنگ کا نشان اندھیرے میں بھی واضح ہو رہا تھا۔

"بہت دور بھاگ رہا تھا بچہ" چھیکو کو پکڑے ہوئے دیوقامت آدمی نے

اسے خالی لفافے کی طرح ہلاتے ہوئے کہا، "اب بھاگ! دیکھتا ہوں کتنا آگے نکلتا ہے تو!"

"تلاشی لو اس پلّے کی!" بابر کے دائیں طرف والے نے حکم دیا۔ اس کے بائیں طرف والے نے سرد مہری سے بابر کا پورا جسم ٹٹولا۔

"واہ! یہ کیا ہے بچے؟"، چھیکو کی قمیص کی جیب سے کیپسولوں کا ایک پورا پیکٹ برآمد ہوا۔

"یہ۔ یہ اماں کے لیے دوائی ہے!"

"اچھا" دیو قامت آدمی نے پیکٹ میں سے ایک کیپسول نکال کر اپنی ہتھیلی پر توڑا، کیپسول میں سے سفید سفید سا سفوف برآمد ہوا۔

"یہ کیا ہے بچے" دیو قامت آدمی نے سفوف سونگھتے ہوئے کہا، "تیری اماں ہیروئن پہ لگی ہوئی ہے؟!" یہ کہہ کر اس نے ایک بھاری ہاتھ کا تھپڑ چھیکو کے گال پر رسید کیا۔

بابر کو اپنا پیشاب نکلتا ہوا محسوس ہوا اور اسے روکتے ہوئے وہ دوہرا ہو گیا۔

"اس سے کچھ برآمد ہوا؟" اس کے دائیں طرف والا پھنکارا۔

"کچھ نہیں" بائیں طرف والے نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"لے چلو ان دونوں کو!"

گاڑی میں پانچ لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی مگر وہ چھ تھے۔

"اسے ہم لئے چلتے ہیں"، دائیں طرف والے نے دروازہ کھول کر بابر کو گاڑی میں دھکیلتے ہوئے کہا۔ دروازہ اس نے چائلڈ لاک لگا کر بند کر دیا۔ "باجوہ اسے تم نزدیکی تھانے میں لے چلو"

"آپ لوگ چلو"، دیو قامت باجوہ ہنستے ہوئے بولا، "اس مچھر کو تو میں دونوں ہاتھوں میں بند کر کے تھانے لے جاؤں گا"۔

دوسرا دروازہ کھول کر دوسرا آدمی بابر کے ساتھ آبیٹھا۔ دائیں، بائیں طرف

والے اگلی سیٹوں پر آبیٹھے۔ پستول انھوں نے اپنے نیفوں میں اڑس لیئے اور گاڑی چل دی۔ آخری چیز جو بابر نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھی، وہ ایک دیو قامت سایہ تھا جس نے دوسرے لڑکھڑاتے سائے کو گردن سے دبوچ رکھا تھا۔

"سیدھا ہو کر بیٹھ!" بابر کے ساتھ بیٹھا آدمی پھنکارا اور بابر تڑپ کر سیدھا ہو گیا۔ اس کی پلکوں سے آنسو چھلک کر جب جھولی میں پڑے، تب اسے احساس ہوا کہ وہ رونے لگا تھا۔

گاڑی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی مین روڈ پر آنکلی۔ ان کے بائیں طرف مینار پاکستان تھا۔ وہ رش میں سے نکلتے ہوئے جی سی ہوسٹل کی طرف بڑھ گئے۔ بابر مسلسل باریک سی آواز میں رونے لگا۔

"چپ!" فرنٹ سیٹ پر بیٹھے دائیں طرف والے نے اسے جھاڑ پلائی اور بابر نے ہچکی لے کر اپنا گلا گھونٹ لیا، "آواز نہ نکلے تیری!"

اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے شرابور تھا۔ سانس گھونٹنے کے باوجود اس کے حلق میں سے "اونھ اونھ" کی آوازیں نکلنے لگیں۔

"طارق اسے ٹشو دے"

طارق نے پیچھے سے ٹشو کا ڈبہ اٹھا کر بابر کی جھولی میں پھینک دیا۔ بابر لرز گیا۔

"آواز نہ نکلے تیری!!" دائیں طرف والا دھاڑا، اور گرم گرم پیشاب کے کچھ قطرے بابر کی ٹانگ پر بہہ نکلے۔

"شکل صاف کر اپنی!"

پندرہ منٹ بعد گاڑی لاہور سکریٹریٹ کی پشت پر بنی ایک کالونی میں داخل ہوئی اور ایک کوٹھی کے آگے آکر رک گئی، بائیں طرف والے نے ہارن بجایا اور کوٹھی کا گیٹ کھل گیا۔ گاڑی کوٹھی میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ دروازے کھلے اور تینوں آدمی گاڑی سے اتر آئے۔

"پاشا صاحب کچھ پیسے دیں فوراً، گیٹ کھولنے والے نوجوان آدمی نے دائیں طرف والے کے پاس آتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" دائیں طرف والے نے سوال کیا۔

"ملک داؤد کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے، اس کی میڈیسن لانی ہے"

پاشا نے جیب میں سے ہزار روپے کا نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیا۔

"دلاور، طارق" پاشا باقی دونوں سے مخاطب ہوا، "اسے کیو روم میں لے چلو۔"

دلاور اور طارق اسے کوٹھی کے اندر لے گئے۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے انہوں نے اسے ایک اندھے کمرے میں پہنچا دیا۔ اسے کمرے میں دھکیل کر انہوں نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

بابر کے اوسان خطا تھے۔ اس نے پلٹ کر دروازے کو دیکھا، جس پر نہ کوئی چٹخنی تھی اور نہ ہی ہینڈل۔ دروازے کا رنگ سفید تھا، دیواریں سفید تھیں، چھت سفید تھی اور کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہ ایک زندان میں تھا جہاں بیٹھنے کے لیے کوئی چیز تک نہ تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر گھسٹتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔

"یہ سب ایک خواب ہے!" اس نے دیوانہ وار سوچا، "ایف ایس سی کا رزلٹ ابھی نہیں آیا اور میں سو رہا ہوں۔ امی جی مجھے اٹھا دیں بہت دن چڑھ چکا ہے!" وہ رو دیا، "امی جی مجھے اٹھا دیں"، مگر زندان کی سپاٹ دیواریں انتہائی مضبوط اور کسی ڈراؤنے خواب سے بھی بھیانک تھیں۔ نہ جانے ان دیواروں سے کتنی چیخیں ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو چکی تھیں، کتنے سر ان دیواروں سے ٹکرائے تھے پر ان دیواروں پر کوئی نشان نہ چھوڑ سکے تھے۔ ان کی اجلی سفیدی کہیں سے بھی ماند نہ پڑی تھی۔ چھت پر لگی دو طاقتور ٹیوب لائٹوں کی روشنی دیواروں سے اچھل کر اس کی آنکھوں سے ٹکرانے لگی اور وہ آنکھوں میں تکلیف محسوس کرنے لگا۔

"یہ خفیہ پولیس والے ہیں"، اس نے سوچا، "سی آئی اے یا ایف آئی اے

پتہ نہیں لیکن یہ خفیہ پولیس والے ہیں۔ یہ اگر کسی کو موت کے گھاٹ بھی اتار دیں تو کوئی انھیں پکڑ نہیں سکتا"۔

"مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا!" اس نے ہذیانی انداز میں سوچا، "میں تو سگریٹ بھی نہیں پیتا!"

"پر انھیں یہ کون بتائے گا؟ اور اکثر نشہ بیچنے والے خود نشہ نہیں کرتے!"

"چھیکو!" اس نے مٹھیاں بھینچ لیں"، اوہ خدایا چھیکو......."

"ایک بار کہیں مل جائے......."

"بس ایک بار......."

"ماں باپ کی نافرمانی کرنے والے کا یہی حال ہوتا ہے بچے!"

"لعنت ہے تجھ پہ ذلیل! یہ کوئی موقع ہے خود سے بکواس کرنے کا؟!"

"یہاں سے تو اب نہیں نکل سکتے!"

"کسی صورت نہیں نکل سکتے"

"خدایا! مجھے معاف کر دے مالک" وہ گڑگڑایا۔

"کیسے کیسے حربے ہوتے ہوں گے ان لوگوں کے پاس باتیں اگلوانے کے لیے!"

خوف سے بابر کے پسینے چھوٹ گئے اور وہ فرش پر ادھ موا سا ہو گیا۔ شدید تکلیف اس کی منتظر تھی۔ بجلی کے [illegible] .... پلاس .... رسیاں .... ڈنڈے .... اس کے اعصاب کتنی تکلیف برداشت کر سکتے تھے، اس سے پہلے کہ وہ ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ کیسی کیسی جسمانی ذلت اس کی منتظر تھی۔ جب وہ اس سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتے۔ اسے کیسی کیسی گھناؤنی حرکتیں کرنے پر مجبور کرتے۔ چیخیں .... واسطے .... دہائیاں .... قسمیں .... وعدے ....

اس کمرے میں کسی چیز کی وقعت نہ تھی۔ یہاں انسان کسی تبیلے میں بند جانور سے بھی بدتر تھا۔ چھری .... چاقو .... میخیں .... سلاخیں .... [illegible]

گندی گندی ننگی گالیاں....... اور آخر میں شکست...... موت نہیں، موت تو ایک خواب تھی، شکست....... بھرپور شکست اس کی ذات کی، اس کی انسانیت کی شکست۔ جب اس کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا کر جرم کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیا جاتا۔ مجرم....... گناہ گار....... سماج کا دھتکارا ہوا....... جیل....... ذلت و رسوائی کی وہ زندگی جس کا کبھی کسی اور کے لیے تصور تک نہ کیا تھا، وہ مقدر بنتی جا رہی تھی۔ ماں....... باپ....... چھوٹا بھائی....... شکلیں....... آنسو....... اٹھتی انگلیاں....... تباہ و برباد....... سب تباہ و برباد اور اس سب کے بعد بھی موت نہیں، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ آخر میں کیسا انسان بن کر وہ ابھرتا؟ ایک مکوڑا، عزت و آبرو کے معنی جسے نہ پتہ ہوتے۔ ایک ذلیل انسان جو نہ جانے کتنے سالوں تک اس دنیا کے گٹروں میں رینگتا۔ پچاس سال کا، ساٹھ سال کا ایک بوڑھا جو کبھی نہایا نہیں، جس کے کپڑوں سے غلاظت کی بدبو اٹھتی ہو، بچے جسے پتھر ماریں، اور ایک دن کسی فٹ پاتھ کے کنارے.......

"نہیں!!!" بابر چلایا، "نہیں!!!"، وہ اٹھ کر دوڑا اور کندھے کے بل دروازے سے ٹکرایا۔

"دروازہ کھولو!" وہ چیخا۔ پیچھے ہٹ کر اس نے پوری قوت سے دروازے کو ٹکر ماری۔ دروازہ دھماکے سے بجا اور اس کے قبضے چرچرا گئے۔

"دروازہ کھولو!" اس نے دروازے کو ٹھوکر ماری اور پھر کندھے کے بل دروازے سے ٹکرایا۔

"کھٹاک!" سے لاک کھلا، دروازہ کھل کر زور سے اس کے کندھے سے ٹکرایا اور بابر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا گرا۔

دلاور نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس پر پستول تان لی۔

"خبردار اگر ہلا تو! تیری کھوپڑی اڑا دوں گا!"

بابر فرش سے اٹھتے اٹھتے ساکت ہو گیا۔ اس کا بایاں ہاتھ دائیں کندھے پر رکھا تھا اور

نظریں دلاور پر گڑی تھیں۔ دلاور کے پیچھے وہ نوجوان آدمی دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے بابر کو دیکھنے لگا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا، میں............"

"چپ!"، دلاور غرایا، "بالکل چپ!" اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں اور ٹریگر گارڈ پر رکھی انگلی کا ناخن دباؤ سے سفید پڑنے لگا۔

بابر نے اسے دیکھا، پھر پستول کو دیکھا جس کی تیل جھانکتی نالی کا رخ اس کی طرف تھا۔

"میں بے قصور ہوں" وہ دانت جماتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

دلاور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ فرش پر پاؤں پھیلائے، کندھا مسلتے اس لڑکے پر حیران ہونے لگا۔ اس کا خوف کے مارے پیشاب نکلا ہوا ہونا چاہیے تھا، اسے ایک کونے میں لگ کر آنسو ٹپکانے چاہیے تھے، اسے معافی کی خاطر گھگھیانا چاہیے تھا، اور یہ.......... ! یہ دروازہ توڑتے ہوئے، پستول کے منہ میں جھانکتے ہوئے اپنے بے قصور ہونے کا اعلان کر رہا تھا!

بابر ٹکٹکی باندھے اسے گھور رہا تھا۔ ٹریگر گارڈ پر دلاور کی انگلی اپنا دباؤ چھوڑنے لگی۔

"صبر کر" دلاور بالآخر بولا، "تو بس صبر کر! تیرا جتنا قصور ہے تو گلا پھاڑ پھاڑ کر ہمیں بتائے گا، ہاں! بس اب تو ہلنا نہیں! ابھی تو آرام کر! ابھی تو سکون کی سانسیں گن! تا کہ تجھے بعد میں پچھتانا نہ پڑے کہ تجھے یہ بھی نصیب نہیں ہوئیں!"

دلاور پیچھے ہٹتے ہوئے ایک ہاتھ دروازے کے کواڑ بند کرنے لگا۔

"نہیں"، بابر اٹھ کھڑا ہوا، اور دلاور کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"مجھے بند کرو گے تو پھر میں اس دروازے میں ٹکریں ماروں گا، یا یہ دروازہ ٹوٹ جائے گا یا میں!"

دلاور کو سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے۔ دروازہ اتنا مضبوط نہیں تھا جتنا کہ لگتا تھا۔ اس

کے جی میں آئی کہ آگے بڑھ کر اس لڑکے کو پستول کا دستہ مار مار کر لہولہان کر دے مگر اسے یقین تھا کہ پھر بھی کوئی فرق نہ پڑنے والا تھا۔ کیا یہ لڑکا پاگل تھا؟

"تو چاہتا کیا ہے؟"

"میرا یقین کرو میں بالکل بے قصور ہوں، میرا اس لڑکے سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں ایک شریف گھر کا لڑکا ہوں، میرا باپ ایک عزت دار پروفیسر ہے اور میرا کسی ہیروئن بیچنے والے سے کوئی تعلق نہیں!"

بات ختم ہونے کا دلاور کو احساس نہ ہوا۔ ایک لمحے بعد وہ چونکا۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی تفتیشی افسر تجھ سے آ کر بات کریں گے۔ جو بھی کہنا ہوگا انھیں کہنا، مگر اس وقت تک .... ! یہ حرکت دوبارہ نہیں ہونی چاہئے!" یہ کہہ کر باہر نکلتے ہوئے دلاور نے دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا۔

"مشتاق"، وہ لاک گھماتے ہوئے نوجوان آدمی سے مخاطب ہوا، "ضیاء صاحب سے کہو اس لڑکے کو آ کر انٹیروگیٹ کر لیں"۔

"مگر ضیاء صاحب نے کہا تھا کہ اسے کم از کم دو گھنٹے بند رکھنا ہے!"

"تمھارا کیا خیال ہے کہ یہ پاگل لڑکا دو گھنٹے تک انتظار کرے گا؟ ان کو صورتحال بتاؤ پھر جیسے وہ کہیں ویسے ہی کریں گے"۔

مشتاق نے تائید میں سر ہلایا اور چل دیا۔ دلاور چند لمحے دروازے کو گھورتا رہا، پھر وہ بھی چل دیا۔

اندر بابر بند دروازے کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں، اس کے دانت بے اختیار کچکچانے لگے اور وہ ڈگمگاتے قدموں پر چلتے ہوئے پھر سامنے کی دیوار سے جا لگا اور پھسلتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور کانپنے لگا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ ٹپکنے لگے، مگر خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کیں، اور آگے پیچھے جھولنے لگا۔ اسے اپنی ماں بہت یاد آنے لگی، اور باپ کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد دروازہ کھلا اور دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک پاشا تھا۔ دوسرا آدمی پاشا سے قد میں چھوٹا تھا۔ اس نے پینٹ شرٹ زیب تن کر رکھی تھی اور اس کے جوتے انتہائی چمکدار تھے۔ پاشا نے ایک ہاتھ سے کرسی اٹھا رکھی تھی جو اس نے بابر کے سامنے لا کر رکھ دی۔ چمکدار جوتوں والا اس پر بیٹھ گیا اور پاشا اس کے پیچھے مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ اس آدمی کی تلوار نما مونچھیں تھیں اور سر کے ستر فیصد بال جھڑ چکے تھے، باقی تیس فیصد اس کے کانوں کو ڈھانپ رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شفیق مسکراہٹ تھی مگر اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس کے سینے میں دھڑکتے پتھر کا پتہ دے رہی تھیں۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے اطمینان سے ڈنہل کا سگریٹ سلگایا اور پھر بابر کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے باریک سی آواز میں پوچھا۔

"بابر"

"باپ کا نام؟"

"پروفیسر طفیل احمد"

"قوم؟"

"راجپوت"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"جی صدر"

"تو لالکھو میں کیا کر رہے تھے؟"

"جی ......"، بابر نے سر جھکا لیا، "میرے والد نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے"۔

چمکدار جوتوں والا ہنس دیا اور بابر کو لگا جیسے کسی نے اسے چانٹا مارا ہو۔ پاشا کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ شکل سے وہ کسی ساحلی علاقے کا رہنے والا لگتا

تھا۔اس کی جلد سانولی تھی، بال گھنگھریالے اور مونچھیں بدمعاشوں کی سی تھیں، وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹیپ ریکارڈر میں یہ گفتگو ریکارڈ کر رہا تھا۔

"کیا نشہ کرتے تھے اس لیئے؟"

"میرا یقین کریں جی میں........."

"صرف جو سوال پوچھا جائے اس کا جواب دو"، گنجے نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی "تم سمجھدار لگتے ہو، ہم جو کام کر رہے ہیں یہ آسان نہیں اور اس کام میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد آدمی کا صبر کا پیمانہ بہت چھوٹا ہو جاتا ہے، اور یہ بات تمھارے حق میں اچھی نہیں ہے، اس لیئے صرف جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔ ہاں، تو تمھارے باپ نے تمھیں گھر سے کیوں نکالا؟"

"میں ایف اے میں فیل ہوا تھا، اس لیئے جی"

"بس اتنی سی بات؟ خیر کوئی بات نہیں۔پہلی بار فیل ہوئے ہو؟"

"جی دو بار"

"شاباش، تمھارا رول نمبر کیا تھا؟"

"جی سات پانچ سو تیرہ"

"اچھا کون کونسے مضمون میں فیل ہوئے؟"

"جی انگریزی میں اور کیمسٹری میں"

"کیمسٹری میں تو نمبر ویسے ہی نہیں آتے"

"جی"

"تو تمھارے کہاں سے آنے تھے" وہ آدمی پھر ہنس دیا اور بابر روہانسا سا ہو گیا۔

"باپ تمھارا کیا کرتا ہے؟"

"جی وہ ایف سی کالج میں پروفیسر ہیں"

"لو۔تو اسے چاہیے تھا تمھیں منٹ میں پاس کروا دیتا"

بابر خاموش رہا۔گنجے کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

"تمھیں اچھا نہیں لگا کہ تمھارے باپ نے تمھیں پاس نہیں کروایا؟" گنجے نے دھیرے سے پوچھا۔

"نہیں جی"

گنجے نے اثبات میں سر ہلا دیا، "نشہ کب سے کرتے ہو؟"

بابر کے ہونٹ کپکپائے، "میں نشہ نہیں کرتا جی"

گنجے نے اپنی سگریٹ بابر کی جھولی میں پھینک دی۔ بابر اچھل کر غیر ارادی طور پر سگریٹ کو جھٹک کر خود سے دور پھینکنے لگا مگر وہ رک گیا۔اس کی کوئی حس خطرے کا الارم بجانے لگی۔اس نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ اٹھالی۔

گنجا بے اختیار تالیاں بجانے لگا، "گڈ گڈ!" وہ دلچسپی سے بولا، "ویری گڈ! بہت اچھے، اب اسے پیو!"

بابر نے سگریٹ ہونٹوں سے لگا لی۔ اس کی آنکھیں گنجے کی آنکھوں سے ملیں اور اس نے کش کھینچا۔ دھواں پھیپھڑوں میں اترا اور وہ دہرا ہو کر کھانسنے لگا۔ سگریٹ اس کے ہاتھ سے گر گئی۔گنجا کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔کھانستے کھانستے بابر آگے کو جھک گیا۔اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

"چلو چلو اب سیدھے ہو جاؤ"، گنجے نے اپنا چمکدار بوٹ بابر کے کندھے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا۔ بابر کے کندھے سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔کھانسی سے بھی وہ تکلیف محسوس کرنے لگا۔اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی۔

"دن کی کتنی پڑیاں بیچ لیتے ہو؟"

"میں نشہ نہیں بیچتا"

گنجے نے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگالی۔

"تمھیں ایک عادی نشہ باز کے ساتھ گرفتار کیا گیا۔تم دونوں سے ہیروئن بھی برآمد ہوئی جو کہ......"

بابر دیوانہ وار اسے ٹوکنے لگا مگر وہ خاموش رہا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی۔

"...... غالباً کیپسولوں میں بھری تھی۔ تمھارا ساتھی اس وقت ہماری تحویل میں ہے اور اس کی خاطر تواضع کی جا رہی ہے۔ یقین جانو اس نے بخوشی اور پورے ہوش وحواس میں، پورے تو خیر نہیں، چلو جو بھی اس کے حواس بچے ہیں، ان کے ساتھ اس نے تمھیں سارے کچے چھٹے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے"

"وہ جھوٹ بولتا ہے"، بابر نے کہا، "اس نے مجھے دھوکہ دیا....."

"کیسے؟"

"میں کام ڈھونڈھ رہا تھا....."

"لال کھوہ میں؟"

"جی"

"تم تو صدر میں رہتے ہو تم وہاں کیا کر رہے تھے؟"

"میری......"

"ذرا اپنا پتہ لکھوانا"

بابر نے اپنا پتہ لکھوایا۔

"اچھا"

"رات میں اپنی خالہ کے گھر رہا....

"تمھارے باپ نے تمھیں گھر سے کب نکالا؟"

"کل"

"اچھا"

"خالہ ریاض مکی میں رہتی ہیں۔ انہوں نے کہا داتا صاحب سلام کر آؤ۔ میں داتا صاحب آیا، وہاں ایک چور نے میری جیب کاٹ لی۔ میں کام ڈھونڈھ رہا تھا۔ اس لڑکے نے کہا میرے پاس کام ہے۔ ڈاکٹر صابر صاحب کو......."

"کیا؟!" گنجا چونک اٹھا۔ "اسے ڈاکٹر صاحب کا نام کیسے معلوم ہوا؟" وہ

مڑ کر پاشا سے مخاطب ہوا۔

پاشا نے کہا "راجو گینگ ڈاکٹر صاحب کا نام لیک کر رہا ہے۔"

"تو اس سپلائرلڑکے کا کیا کیا؟" ضیاء نے اس سے پوچھا۔

"اسے باجوہ کے حوالے کر دیا" پاشا نے مختصر سا جواب دیا۔

"ٹھیک ہے" ضیاء پھر سے بابر کی طرف متوجہ ہوا۔

"آگے چلو"، وہ بابر سے مخاطب ہوا۔

"کہ ڈاکٹر صاحب کو کمپونڈر کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ اس نے کہا میں تمھیں کام لگوا دیتا ہوں، میں نے کہا ٹھیک ہے، ڈاکٹر صاحب کے پاس لے چلو۔ وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر جا رہا تھا جب اوپر سے آپ لوگ آ گئے"

"تو اب کیا ارادے ہیں؟" گنجے نے بابر سے پوچھا۔ بابر نے چونک کر اسے دیکھا اور گنجا کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"معاف کرنا یار مجھے بات بات پر مذاق سوجھتا ہے"، گنجا ہنستے ہوئے بولا، "تم ہنس نہیں رہے؟"

بابر نے بے بسی سے دانت نکال دیئے۔

"شاباش۔ تم مجھے اچھے لگے ہو، اور واقعی میں مجھے نظر آ رہا ہے کہ تم اس پوڈریئے کے ساتھی نہیں ہو سکتے۔ یہ پاشا صاحب ہیں۔ غالباً ان سے تمھاری ملاقات ہو چکی ہے، میں نے اپنا تعارف کروایا؟ نہیں؟ اوہو، میرا نام فاضل ضیاء ہے، اور میں یہاں ایف آئی اے کا سیکشن چیف ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا پاشا صاحب تم سے کچھ ضروری سوال پوچھیں گے اور اگر تم نے ان کے ٹھیک جواب دیئے تو تم ہمیں اور بھی اچھے لگو گے پھر ہم بھی تمھیں بہت زیادہ اچھے لگیں گے۔ اگر غلط جواب دو گے تو تو......" اس نے کندھے اچکا دیئے۔

"مجھے اجازت؟" ضیاء نے اٹھتے ہوئے بابر سے پوچھا۔

"سر جی؟"، بابر بولا اور ہنستا ہوا ضیاء اٹھتے اٹھتے رک گیا، اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

"مجھے غسلخانے جانا ہے"۔

ضیاء اور پاشا قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"ابو نے بہت جوتے مارنے ہیں"، بابر سوچنے لگا۔ وہ فرش پر بچھے گدے پر لیٹا دیوار پر جلتے زیرو کے بلب کو گھور رہا تھا۔ رات گیارہ بجے کا وقت تھا اور اس کا جسم تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔ کیو روم میں خاصا حبس ہو رہا تھا مگر بابر اپنے نیچے فرش پر بچھے پتلے گدے کی گدازی کا شکر گزار تھا۔

"یا الٰہی"، اس نے سوچا، "تو رحیم ہے، کریم ہے۔ اس جہنم میں بھی تو نے یہ بچھونا عطا فرما دیا ہے، مالک میں تیرا شکر گزار ہوں"۔

پسینے سے اس کا جسم شرابور تھا اور وہ اپنے جسم کو ساکت رکھتے ہوئے ہوا کی غیر محسوس نقل و حرکت کو محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔ جو کھانا ایف آئی اے والوں نے اپنے لئے پکوایا تھا وہی اسے ملا تھا۔ مشتاق اس کے لیے مکس سبزیوں کی ایک پلیٹ اور روٹیاں لیکر آیا تھا۔ انھوں نے اس سے بہت سے سوال پوچھے تھے، پاشا نے، اور پھر مشتاق نے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی اور کو اس کی شکل دے کر اس کے گھر میں بھیج دیتے، تو وہ بڑے آرام سے وہاں رہ سکتا تھا۔ اسے اپنے دماغ کے دریچے بند ہوتے ہوئے محسوس ہوئے اور وہ سو گیا۔

صبح دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ بیدار ہوا۔ مشتاق دروازے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ابھی تک آرام ہو رہا ہے"، مشتاق مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں جی بس۔ السلام علیکم"

"وعلیکم السلام۔ ارے یار ابھی یہ بستر تہہ نہ کرو"

بابر گدا تہہ کرتے ہوئے رک گیا۔

"اسے ابھی یہیں رہنے دو۔ آؤ۔ تمھیں غسلخانے جانا ہوگا"

بابر مشتاق کے ساتھ ہولیا۔ مشتاق چوبیس سال کا نوجوان تھا۔ یہاں جو آدمی بابر نے دیکھے تھے، وہ ان سب سے کم عمر، اور سب سے زیادہ خوش شکل اور خوش اخلاق تھا۔ وہ ساہیوال کا رہنے والا تھا اور اس کی بھرپور مسکراہٹ ایک خوش کن دل کا پتہ دیتی تھی۔ اس کی آواز میں شائستگی تھی۔ اسے سوچتے ہوئے اپنی تیکھی ناک کو چھیڑنے کی عادت تھی اور ہنستے ہوئے اس کے گالوں میں ڈمپل پڑتے تھے۔ اٹھے ہوئے ابرو بھوری آنکھوں پر بھلے لگتے تھے۔ اس نے بابر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا جو کہ بابر نے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ وہ کسی حد تک بابر سے مرعوب نظر آتا تھا لہٰذا بابر نے کوشش کی کہ بالکل ہی اس کے پیروں میں نہ بچھ جائے تا کہ اس کا بھرم زائل نہ ہو۔ غسلخانہ کوٹھی کے پچھواڑے میں تھا اور صحن میں لگی کلیوں کی کیاری کے پاس باجوہ کھڑا مسواک کررہا تھا۔

بابر کو دیکھ کر باجوہ مسکرایا۔ باجوہ کی موٹی گردن کسی سانڈ کی گردن سے مشابہ تھی۔ وہ ہر وقت بالوں کو تیل لگائے رکھتا تھا۔ دائیں کنپٹی سے اس کے خاصے بال اڑ گئے تھے۔ اس کی پہلوانوں جیسی مونچھیں تھیں اور قمیص کے اوپر والے بٹنوں میں سے سینے کے ریچھ جیسے بال جھانکتے تھے۔ اس کی ناک چھوٹی اور موٹی تھی۔ ایسی ناک جس کا لڑائی میں ٹوٹنے کا کوئی ڈر نہیں تھا کیونکہ ناک کی ہڈی بالکل چپٹی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جذبات سے عاری تھیں۔ اس کی بھرپور بتیسی میں مسواک کے کچلے ہوئے ریشے پھنسے تھے اور ہونٹوں کے کناروں سے مسواک کا رس بہہ رہا تھا۔

"ککڑ بانگیں دے کر حلال بھی ہو گئے اور تو اب اٹھ رہا ہے"، وہ مسواک تھوکتے ہوئے بولا۔ بابر خاموش رہا پر مشتاق ہنس دیا۔

"جگرا ہے"، باجوہ مسواک کرتے ہوئے بولا "جگرا ہے۔ نظر آتا ہے، کام آئے گا، بہت کام آئے گا"، یہ کہہ کر کلی کر کے وہ چل دیا۔

بابر جب غسل سے فارغ ہوا تو مشتاق اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ بابر کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"اب تم ہمارے مہمان ہو"، مشتاق ہنسا، "مہمان تو خیر تم پہلے بھی تھے، سرکاری مہمان، مگر اب نہیں!"

بابر کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اسے سمجھ نہ آئی کہ آنسوؤں سے روئے یا قہقہہ لگا کر ہنسے، سجدے میں گر جائے یا کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر پورے عالم کو اپنی خوشی کی نوید دے۔

"آپ نے مجھے بے قصور مان لیا؟"

"ہاں کہہ سکتے ہو"

بابر کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"اپنے طور پر ضیاء صاحب اور پاشا صاحب کو یقین ہے کہ تم بے قصور ہو، بس پیچھے سے تمھارے کوائف وغیرہ چیک کریں گے اور بس!"

"کب؟"

"ابھی صبر کرو۔ اس میں کچھ دیر ہے"

"وہ کیوں؟"

"یہ ایف آئی اے ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ ایک تمھارا ہی کیس ہمارے پاس ہے؟ اس ملک میں اتنا کچھ ہو رہا ہے جس کا تمھیں علم نہیں، ملک دشمن عناصر کس کس طرح وطن پاک کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہم کیسے کیسے اپنی سرزمین کا دفاع کر رہے ہیں کسی کے علم میں نہیں ہے، اور نہ ہی ہم کسی کے علم میں لانا چاہتے ہیں۔ عام شہری امن و سکون سے زندگی گزاریں، یہی ہمارا مشن ہے۔ رہ گئی تمھاری بات تو ہمارے پاس کام زیادہ ہے اور آدمی کم۔ تمھارا کیس ایگزامینیشن کیو

میں لگ گیا ہے، جیسے ہی تمھارا نمبر لگے گا، جانچ پڑتال کے بعد تم فارغ"

"او!"

"ہاں"

"تب تک!"

"تب تک ملزم متعلقہ تھانے کی حوالات میں رہتا ہے یا ہمارے سپیشل برانچ کے سیل میں، مگر تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ تمھارے کیس میں خصوصی طور پر فاضل ضیاء صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو درخواست دی ہے کہ تمھیں یہیں رہنے دیا جائے، بلکہ یہاں رہنے کی آزادی دی جائے۔ تمھارے تو وارے نیارے ہو گئے ہیں!"

مشتاق ہنس دیا۔

بابر خاموشی سے سنتا رہا۔

"یہ ڈاکٹر صاحب کون ہیں؟" کچھ دیر بعد وہ بولا۔

"ہمارے سیکشن انچارج، بچے اپنی قسمت پر ناز کر! تجھے کہیں تیرے یار چھیکو کا حال دکھا دیں تو تیری روح کانپ اٹھے"

"نہیں نہیں!" بابر جلدی سے بولا، "میں کتنا شکر گزار ہوں آپ سوچ بھی نہیں سکتے"۔

"ہاں۔ اچھا یہ بتا سولیٹائر کھیل لیتا ہے؟"

"سولیٹائر؟ ہاں جی"

"شاباش! چل آ جا پھر!" دونوں میز کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے میز پر پڑا کمپیوٹر مشتاق نے آن کیا اور دونوں سولیٹائر کھیلنے لگے۔

بابر اس گھر میں دو دن تک رہا، اور ان دو دنوں میں اس کا کچا ذہن یہ جان گیا کہ اچھائی اور برائی میں فرق کیا ہے، درحقیقت کچھ بھی نہیں۔ بظاہر یہ لوگ ملک کے وفادار سپاہی تھے مگر ان سب میں وہ خرافات موجود تھیں جنہیں دیکھتے ہوئے انھیں مجاہد کہنا مضحکہ خیز لگتا تھا۔ یہاں بابر نے پہلی مرتبہ شراب دیکھی۔ اس نے شراب کا ذکر

ضرور سنا تھا، یاروں دوستوں سے، ان سے جو پیتے تھے، مگر اب سے پہلے شراب دیکھی نہ تھی۔

اس مشروب کی زخم صاف کرنے والی دوائی اور پھلوں کی سی ملی جلی بو تھی، اور وہ بوتلیں جن میں یہ مشروب بھرا ہوا تھا، ان جیسی خوبصورت بوتلیں اس نے آج تک نہ دیکھی تھیں۔

طارق نے اسے ایک جام آفر کیا، مگر اس نے پلکیں جھکا کر نفی میں سر ہلا دیا، اور وہ سب قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

"صدقے جاؤں تیری معصومیت کے"، دلاور ہنستا ہوا بولا۔ وہ نشے میں دھت ہو رہا تھا، "مجھے اپنا پہلی بار شراب پینا یاد آ گیا!"

"ہائے!" طارق نے سرور میں آ کر آنکھیں بند کر لیں، "وہ پہلی بار کا نشہ پھر کہاں نصیب ہوتا ہے!"

بابر اس وقت طارق، دلاور اور مشتاق کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی اور وہ لوگ شراب سے شغل کر رہے تھے۔ جس کوٹھی میں وہ تھا اس کی تین منزلیں تھیں۔ ایک تہہ خانہ جس میں کیو روم تھا جہاں اسے رکھا جا رہا تھا۔ کیو روم کے علاوہ تہہ خانہ میں ایک باورچی خانہ تھا اور سیڑھیوں کے ساتھ ایک چھوٹا سا ہال جس میں کیو روم کا دروازہ کھلتا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر کئی کمرے تھے مگر اسے ان میں سے کسی میں جانے کی اجازت نہ تھی سوائے اس کمرے کے جو مشتاق کا دفتر تھا، جہاں وہ کمپیوٹر پہ بیٹھ کر رپورٹیں تیار کرتا تھا۔ دوسرا ٹی وی لاؤنج تھا جہاں وہ اب بیٹھا تھا۔ اسے اوپر والی منزل پہ بھی جانے کی بالکل اجازت نہ تھی مگر باتوں باتوں میں اسے معلوم ہوا کہ اوپر والی منزل پر ضیاء اور ڈاکٹر صاحب کے دفتر اور ایک سٹور روم تھا۔ یہاں کا نچلا عملہ باجوہ، دلاور، طارق اور مشتاق پر مشتمل تھا اور وہ لوگ سکواڈ کے رکن تھے جس کا سربراہ پاشا تھا۔ ضیاء آپریشن چیف تھا اور سکواڈ کو ڈاکٹر صابر کی ہدایات ضیاء کے ذریعے پہنچتی تھیں۔ ڈاکٹر صابر سیکشن ہیڈ تھا اور بقول مشتاق ان کے سیکشن کے

ذمے فیلڈ ورک تھا، اور وہ لوگ دوسرے سیکشن سے انٹیلی جنس ٹپ ملنے پر کام کرتے تھے۔ بنیادی طور پر ان کا کام ملک دشمن عناصر کا کھوج لگانا اور انھیں گرفتار کرنا تھا۔ یہ سب باتیں بابر کے لیے کسی الف لیلوی کہانی سے کم نہ تھیں۔

"یاد ہے ٹریننگ کیمپ میں میجر رائے"، طارق نشے میں جھومتے ہوئے بولا۔

"سالا پٹیالہ کا کتا!"، ولا اور جام میں شراب ڈالتے ہوئے بولا۔

"ہاں! میجر کہتا تھا کہ پہلا جام پینے کے بعد آدمی ایک بار پھر پیدا ہوتا ہے!"

"وہ کیسے؟"

"وہ ___ وہ ایسے کہ ___ کہ ___ پتہ نہیں کیسے!"

"ہاہاہاہاہاہا!"

بابر مسکرا دیا۔ اسے ان کی باتوں سے الجھن سی ہو رہی تھی اور شراب کی بو سے اسے ابکائی سی آنے لگی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ مشتاق نے بدمست نظروں سے اسے دیکھا اور آنکھ ماری۔ بابر مسکرا کر کمرے سے نکل آیا۔

کمرے کا دروازہ ایک راہداری میں کھلتا تھا جس کے ایک سرے پر مکان کا مین دروازہ تھا اور دوسرے سرے پر مشتاق کا کمپیوٹر روم۔ لاؤنج کا دروازہ بند کرتے ہوئے وہ مین دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پوری کوٹھی میں خاموشی چھائی تھی اور بہت سے کمرے اندھیرے میں ڈوبے تھے، صرف لاؤنج سے شور وغل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سیڑھی کے پاس پہنچ کر اس نے اوپر نیچے دیکھا۔ اوپر والی منزل اندھیرے میں ڈوبی تھی جبکہ نیچے ہال میں ایک بتی جل رہی تھی۔ بابر دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ سانس روک کر اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھل گیا۔ اس کے سامنے، پورچ سے بیس قدموں کے فاصلے پر کوٹھی کا مین گیٹ تھا اور باہر بھی کوئی نہیں تھا۔ اس نے گردن نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ بائیں طرف پورچ میں سے کوٹھی کی

چار دیواری اور مکان کی دیوار کے بیچ ایک چھوٹی سی گلی کا منہ تھا۔ پورچ خالی تھا، جس گاڑی میں اسے لایا گیا وہ غائب تھی۔ دائیں طرف ایک چھوٹا سا لان بھی خالی پڑا تھا۔ بابر کا دل تیز دھڑکنے لگا۔ کوٹھی کا گیٹ اندر سے بند تھا مگر اسے صرف کنڈا لگا تھا، یہی حال چھوٹے گیٹ کا تھا۔ وہ بھاگ سکتا تھا۔

"نہیں!"، بابر نے سوچا، "ذرا تحمل سے سوچ!"

یہاں کل سات افراد تھے جن میں سے تین نشے میں دھت پڑے تھے۔ کوٹھی خالی تھی اور گاڑی غائب تھی جسکا مطلب یہ کہ رستہ صاف تھا، لیکن نہیں، اسے اپنا پکڑا جانا، یہاں لایا جانا، کراس ایگزامینیشن یاد آ گئی اور اس کی پیشانی پر پڑی شکنیں غائب ہو گئیں۔ وہ اس کے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیل رہے تھے۔

بابر دروازہ بند کر کے اندر جانے لگا۔

"نہیں" پھر اس نے سوچا، "اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چوہا بل سے نہیں نکلا اور یہ چیز بلی کو خوار کرے گی۔ یہ لوگ میری ہمت سے مرعوب ہیں، اگر باہر نہیں نکلوں گا تو یہ سمجھیں گے کہ میں ڈر گیا اور پھر میں انکے رحم وکرم پر ہوں گا۔ مجھے باہر نکلنا چاہیے پر بھاگنا نہیں چاہیے، تاکہ یہ مجھے پکڑنے پر خوش ہو سکیں اور میرے نہ بھاگنے سے میری قدر کر سکیں!"

اس نے پورچ میں نکل کر دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا۔ بجائے مین گیٹ کی طرف جانے کے وہ لان کی طرف چل دیا۔

گیٹ پر جلنے والے گلوب لان میں روشنی کر رہے تھے مگر پودوں کے پیچھے سائے چھپے تھے۔ وہ لان میں لگی کرسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے ہی وہ کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھنے لگا، پیچھے آنے والے کتے نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

"بھوں!!"

"آ آ آ"، بابر تیزی سے گھوما اور بھورے رنگ کے بھاری جسامت کے کتے کے پنجے اس کے سینے پر لگے۔ بابر لڑکھڑایا، کرسی اس کے گھٹنوں کی پشت پر لگی اور وہ

اس پر بیٹھتا چلا گیا۔ دیوہیکل کتا اس کی جھولی میں آ گرا۔ اس کا منہ بابر کی جھولی میں گھستا چلا گیا۔ ہوا میں معلق پچھلی ٹانگوں کے زور پر کتے نے قلابازی کھائی، اس کی کمر بابر کے سینے سے ٹکرائی اور کتے کی بھاری دُم کا چانٹا بابر کے گال پر پڑا۔ بابر نے لرز کر دونوں پیروں سے خود کو پیچھے کو دھکیلا۔ کرسی الٹی اور بابر اپنی جھولی میں گرے کتے کو لیے کرسی کے ساتھ الٹی قلابازی کھا گیا۔

کتا دوسری بار قلابازی کھاتے ہوئے دھپ سے گھاس پر گرا، بابر اس کے اوپر اور کرسی کی پتلی پتلی لوہے کی پٹیاں جھنجھناتی ہوئیں بابر کے سر سے ٹکرائیں۔

کتے نے گھاس پر پلٹی کھائی۔ اس کی گرم سانس کا بدبودار بھبھکا بابر کے گال سے ٹکرایا اور کتا پوری قوت سے بابر کے کان میں بھونکا۔

بابر چیخا۔ دونوں ہاتھوں سے کتے کی کھال کھینچتے ہوئے اس نے پوری قوت سے خود کو پیچھے کی طرف بھرپور دھکا دیا۔ اس کی پشت پر پڑی کرسی گھاس پر قلابازیاں کھاتی ہوئی پودوں کی کیاری میں جا گری اور بابر پیچھے اچھل کر چاروں شانے چت گھاس پر گرا۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

کتا چاروں ٹانگوں پر کھڑا ہوتے ہوئے لڑکھڑایا۔ سر جھٹکتے ہوئے وہ غرایا اور ایک بار پھر بابر کی طرف لپکا۔

"جیک!!" کوئی بلند آواز میں دھاڑا۔ کتا ایک لمحے کے لیے جھجکا اور پھر بابر پر جھپٹا۔ بابر کو کتے کے کالے ہونٹوں کے پیچھے لگے لمبے دانت نظر آئے اور وہ پیچھے کو گھسٹنے لگا۔

"جیک ہیل!! ہیل!!"

کتا گھاس میں پنجے گاڑ کر رک گیا اور پوری قوت سے بابر پر بھونکنے لگا۔ بابر کو اپنے کانوں کے پردے لرزتے ہوئے محسوس ہوئے۔ آواز کی شدت سے اس کی بینائی متزلزل ہو گئی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ کوئی بھاری قدموں سے بھاگتا ہوا آیا اور آتے ہی اس نے کتے کے پٹے پر ہاتھ ڈال

دیا۔ کتا غرانے لگا۔ بابر نے آنکھیں کھولیں تو اس کے سامنے باجوہ کتے کے پٹے پر ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔

"کیوں بابو؟" باجوہ ہنستے ہوئے بولا، "سیر کو جا رہے تھے؟"

بابر اٹھ کر بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"کہو تو باہر گھمانے پھرانے لے چلوں؟" باجوہ نے قہقہہ لگایا۔

"میں تو بس لان تک آیا تھا"

"قسمت اچھی ہے بچے، پر نہیں، تو قسمت کا دھنی ہے۔ اگر گیٹ کی طرف جاتا تو یہ تیری زندگی کی آخری حرکت ہوتی!"

"میں گیٹ کی طرف نہیں جا رہا تھا۔"

باجوہ نے تائید میں سر ہلا دیا۔ "اٹھ جا"، وہ بولا۔

بابر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کتا مسلسل غرا رہا تھا اور جب اس نے کتے کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ بھونک اٹھا۔

"ہے جیک"، باجوہ نے اسے پچکارا، "بس! بس!"

"آ جا میرے ساتھ"، باجوہ بابر سے مخاطب ہوا۔

بابر نے دیوار کے ساتھ لگی ٹونٹی سے ہاتھ منہ اور گردن دھوئی۔ باجوہ نے چھوٹا گیٹ کھولا اور وہ کتے کو لے کر باہر آ گئے۔

"یہ اس کی سیر کا وقت ہے"، باجوہ کتے کی کھال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "یہ میرے بچوں کی طرح ہے۔ پہلے یہ کسی اور کا تھا مگر اب یہ میرا ہے"۔

باجوہ نے سڑک پر آ کر کوٹھی کی دوسری منزل کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔

جیک بابر کو سونگھنے کے لیے آگے بڑھا۔ بابر ایک قدم پیچھے ہو گیا

"جیک!"، جیک جھینپ کر دوڑتا ہوا ان سے کچھ آگے نکل گیا۔

"گھر یاد آ رہا ہے؟" باجوہ نے بابر کے بجھے ہوئے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی"

"ہاں، گھر کی اہمیت کا اندازہ گھر سے نکلنے کے بعد ہی ہوتا ہے"

بابر نے سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں باجوہ کا چہرہ پہلی بار غور سے دیکھا، اور اسے اس کے سپاٹ چہرے کے پیچھے ایک لمحے کے لیے جذبات کی ایک حرکت سی نظر آئی۔

" آپ کو کتنی دیر ہوئی ہے گھر سے نکلے ہوئے؟"

باجوہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا نقاب گر گیا اور بابر کو اس کی مردہ انسانیت کا چہرہ نظر آیا، مگر پھر اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھر آئی اور پھر وہی چہرہ اس انسانیت کے قاتل کا چہرہ بن گیا۔

"اچھا!"، وہ سرد مہری سے مسکراتے ہوئے بولا، "تو باتیں پلٹنا جانتا ہے۔ اچھی عادت نہیں ہے بچے، نقصان پہنچا سکتی ہے!"

بابر نے خاموشی سے سر جھکا لیا اور چلتے چلتے جیک کو دیکھنے لگا جو جھاڑیوں میں کچھ سونگھ رہا تھا۔

"جا"، باجوہ خاموشی سے بولا، "اندر چلا جا، سیدھا کیو روم میں جا، بغیر کسی سے بات کیے، اور دروازہ بند کر لینا، وہ خود بخود لاک ہو جائے گا۔ میں بھی اندر ہی آ رہا ہوں۔ مجھے باہر نہ نظر آنا۔ جیک!!" اس نے زور سے کتے کو آواز دی، اور جیک تڑپ کر واپس دوڑا۔

بابر نے نفرت سے منہ بنایا اور واپس چل دیا۔ دل ہی دل میں باجوہ کو گالیاں دیتے ہوئے وہ کوٹھی کے گیٹ پر آ پہنچا، گیٹ کا ہینڈل اٹھا کر وہ اندر داخل ہونے ہی لگا تھا کہ کنڈا گراتے ہوئے وہ پلٹا۔

سامنے کے مکان کی اوپر والی کھڑکی کھلی تھی۔ جس کمرے کی وہ کھڑکی تھی وہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف ایک چھوٹا سا سرخ نقطہ جل رہا تھا۔ چاند کی روشنی کا عکس کھڑکی میں موجود کسی چیز میں پڑ رہا تھا۔ بابر کو شک گزرا کہ شاید کھڑکی میں کیمرہ نصب تھا۔

وہ سرخ نقطہ بجھ گیا مگر چاند کی روشنی کیمرے کے لینز کی بدستور چغلی کھا رہی تھی۔ جیک بھونکا۔ باجوہ اسے لے کر واپس آ رہا تھا۔ بابر ہلا اور وہ سرخ نقطہ پھر جل اٹھا وہ ساکت ہوا اور ایک لمحے بعد نقطہ بھی بجھ گیا۔ بابر نے کوٹھی میں داخل ہو کر گیٹ بند کر دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ چھوٹا سا نقطہ پھر جل اٹھا تھا۔ برآمدہ پار کرتے ہوئے جب وہ اندر داخل ہوا تو لاؤنج سے اب بھی ہنسنے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے کیو روم میں داخل ہو کر لات مار کر دروازہ بند کیا اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد روم کی بتی بجھ گئی۔

اسے بیدار ہوئے بہت وقت ہو چکا تھا مگر ابھی تک روم کا دروازہ کسی نے نہیں کھولا تھا اور کمرہ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ اسے یقین تھا کہ صبح ہو چکی تھی۔ روم میں کوئی کھڑکی نہ تھی، کوئی روشندان نہ تھا، مگر اس سفید قبر میں بھی صبح کا احساس موجود تھا۔

اس کی حالت پنجرے میں بند کسی پرندے سے مختلف نہ تھی۔ پرندہ کم از کم اپنے قید کرنے والوں کو دیکھ تو سکتا تھا، یہاں صرف سفید اندھیرے تھے۔ غالباً یہ کیو روم کی اجلی سفیدی قیدی کو ذہنی انتشار میں مبتلا کرنے کے لیے کی گئی تھی اور وہ اندھیرے کے لیے شکر گزار تھا۔

وہ سوچنے لگا گھر واپس جا کر کیا کرے گا۔ کیا بتائے گا کہ اس پر کیا بیتی؟ کون اس پر یقین کرے گا؟ کیا سب پھر سے اسے قصوروار ٹھہرائیں گے؟ کیا ضرورت تھی ابو کو ٹیپ توڑنے کی؟ کیا ضرورت تھی انہیں اس کی چیزیں باہر پھینکنے کی؟ کس کو کسے معاف کرنا چاہیے تھا؟ اگر ابو کا دل دُکھا تھا تو کیا اس کا نہیں دُکھا تھا؟ ہمیشہ امی نے ابو کی سائیڈ لی، جب وہ غلط تھے تب بھی۔ بچپن میں وہ اور طاہر گھر کے سامنے گلی میں کرکٹ کھیلتے تھے۔ ابو نے اس کا بلا توڑ دیا تھا کیونکہ بقول ان کے وہ اس کے لکھنے پڑھنے کے دن تھے۔ ابو کے سامنے امی نے بھی اسے ڈانٹا تھا مگر بعد میں ہمیشہ کی طرح سینے سے لگا لیا تھا، مگر امی کیا اس طرح دل کی تکلیف دور ہوتی تھی؟ اور اس دن، خالہ

کے گھر، پرسوں، جو کہ اب صدیوں پہلے کسی اور زندگی کا حصہ لگتا تھا، اس دن اسے امید تھی کہ وہ اسے ڈانٹنے کے بعد سینے سے لگالیں گی، پر نہیں، امی کے اندر بھی ابو چھپے تھے۔ وہ مانتا تھا کہ ان کی ساری باتیں سچی تھیں، پھر اس کے دل میں درد کے انگارے کیوں تھے، اس کے اندر ایک ننھے بچے کی آواز تھی جو کبھی سنی نہیں گئی۔

وہ اندھیرے میں سسکیاں لینے لگا، وہ روتا نہیں تھا، وہ رونے پیٹنے والوں میں سے نہیں تھا، مگر پھر بھی ...... عالمگیر! ایک ناقابلِ تسخیر شخصیت! یہ نام اس نے اپنے لیئے چنا تھا، بابر عالمگیر۔ یہ وہ نام تھا جس سے وہ چاہتا تھا کہ دنیا اسے پکارے۔ ایک ایسا انسان جو ہر مصیبت سے، ہر طوفان میں سے فاتح بن کر ابھرے، وہ ایک ایسا انسان بننا چاہتا تھا۔ اس نے محمد بن قاسم کی کہانی پڑھی تھی اور اس کتاب کو وہ اپنی جان سے بھی عزیز سمجھتا تھا۔ محمد بن قاسم کو اپنی محنت کا پھل کیا ملا تھا؟ موت! مگر وہ عالمگیر تھا! وہ یقیناً ایک عالمگیر تھا! ایک ایسا فاتح جسے اس دنیا میں اس کی فتح کا پھل ملنا اس کی فتح کی توہین تھی! اس فاتح نے ہندوستان کے دروازے اسلام کے لیے کھول دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے آج پاکستان بنا تھا۔

ہمیشہ کی طرح آج پھر اس کا دل خلوص سے موم ہو گیا۔ وہ بھی ایک ایسا انسان بننا چاہتا تھا۔ محمد بن قاسم نہیں! توبہ توبہ! مگر اپنے طور پر وہ بھی ایک عالمگیر بننا چاہتا تھا، کوئی ایسا کام کر جانا چاہتا تھا کہ دنیا اسے تسلیم کرتی یا نہ کرتی، خدا کے حضور وہ فاتح بن کر جانا چاہتا تھا۔

"لگتا ہے سب شراب پی کر سوئے ہوئے ہیں"، بابر ایک [illegible] سے حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔ باہر ایک آہٹ سی ہوئی، اور پھر خاموشی چھا گئی۔

وقت گزرتا گیا۔ وقت کا حساب اس نے اپنی نبض پکڑ کر کرنے کی کوشش کی، مگر تین سو چوالیس پہ آ کر اسکا دھیان ٹوٹ گیا۔ اتنی دیر میں شاید دس منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے۔ اس نے پھر سے سونے کی کوشش کی پر سو نہ سکا، تنگ آ کر وہ اٹھ کر اندھیرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے ٹہلتے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک جھماکے سے

ٹیوب لائیٹیں جل اٹھیں اور بابر نے تڑپ کر اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیئے۔

مشتاق کمرے میں داخل ہوا، "اٹھ گیا ہے بیڑو؟!" وہ جماہی لیتے ہوئے بولا، "میرا تو سر درد سے پھٹا جا رہا ہے!"

بابر نے آنکھوں کے سامنے سے ہاتھ ہٹائے اور پلکیں جھپکنے لگا، اسے آنکھوں کے سامنے عجیب وغریب قسم کے رنگ نظر آنے لگے۔

"رات بہت زیادتی کی اپنے ساتھ"، مشتاق سر کھجاتے ہوئے بولا، صورت سے لگ رہا تھا کہ وہ ابھی سو کر اٹھ رہا تھا۔

"طارق صاحب کی حالت تو بہت جلدی خراب ہونے لگی تھی"، بابر مسکراتے ہوئے بولا۔

مشتاق ہنس دیا، "ہاں، وہ پیٹ کا ہلکا ہے، اسے ہضم نہیں ہوتی، او!، "ہنسی سے اس کا سر دکھنے لگا۔

"بابر؟"، وہ ایک وقفے کے بعد بولا۔

"جی؟"

"ناشتہ تو بنا یار؟"

بابر کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ حرکت میں برکت تھی اور اس کمرے سے اسے نفرت ہونے لگی تھی۔

"ناشتہ بنا لو گے؟"

"جی"

"کیا بناؤ گے"

"جو آپ کہو"

"آملیٹ بنا لو گے؟"

"فرائی انڈہ بنا لوں گا"

"بلے بھئی بلے"، مشتاق بولا، "فریج میں چھ سات انڈے پڑے ہیں،

سارے فرائی کرلو۔ساتھ میں ڈبل روٹی ٹوسٹ کرلینا۔چائے بنالیتے ہو؟"

"کتنے کپ؟"

"آہم! ایسا کرو تھرماس پورا بھرلو۔تھرماس ہے کچن میں۔فریج میں مکھن جام پڑا ہے وہ بھی نکال لینا"۔

"جی اچھا!"

"مہربانی ہے یار تمھاری ورنہ میں تو......"

"نہیں نہیں! مہربانی والی کونسی بات ہے"۔

"بنا کے سب کچھ اوپر لاؤنج میں........ نہیں! وہاں طارق کمبخت نے الٹی کی ہے، میرے کمرے میں لے آنا، ناشتہ وہیں بیٹھ کر کریں گے"

بابر نے کچن میں جا کر فریج کھولی اور سامان باہر نکالنے لگا۔

انڈے فرائی کرکے اس نے پلیٹوں میں ڈالے اور دونوں ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے وہ مشتاق کے کمرے میں لے گیا۔وہاں دلاور، طارق اور مشتاق بیٹھے تھے۔

"جیو میرے شہزادے!"، دلاور انڈوں کی خوشبو سونگھ کر بولا۔

بابر کو طارق نے غسل کروایا اور وہ بھی ان کے ساتھ ناشتے میں شامل ہوگیا۔

انہوں نے اس کے ہاتھ کی بنی چیزوں کی کھل کر تعریف کی۔

"بس! آج سے تو مشتاق کے کمرے میں رہے گا"، طارق اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا، "لعنت بھیجو اس منحوس قید خانے پہ!"، سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

پاشا آکر ان کے ساتھ ناشتے میں شامل ہوگیا۔وہ کچھ پریشان لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے پاشا؟" دلاور نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا، "خیریت تو ہے؟"

"اوپر سے بہت سخت آرڈر آئے ہیں"، اس نے انڈے پہ نمک اور کالی مرچ چھڑکتے ہوئے کہا۔

بابر بھی پوری توجہ سے پاشا کو دیکھنے لگا۔

"کل رات؟"

"ہاں"، پاشا بولا، "کل رات میں، ضیاء اور ڈاکٹر صاحب رسیونگ ہیڈ گئے تھے، انھوں نے تو ہمیں اوپن کرنے کا پورا پروگرام صادر کردیا ہے"۔

"نہیں!"، طارق بے اختیار بول اٹھا، نوالہ اس کے ہاتھ سے رہ گیا۔

"ہاں"، پاشا نے آہستہ آہستہ چباتے ہوئے کہا، "ڈاکٹر صاحب بھی کل رات پھٹ پڑے کہ ہمیں کچھ وقت چاہیے۔سیٹ اپ ابھی تیار نہیں ہوا۔پروگرام الٹرنیٹ بی ٹیم کو صدر کردیا جائے، پر نہیں! جانتے ہو بی ٹیم کامپرومائز ہوچکی ہے؟"

"کیا؟"، اس بار دلاور کے ساتھ مشتاق اور طارق بھی بول اٹھے۔

"ہاں، بی ٹیم اب نہیں رہی........!"، پاشا نے سر ہلاتے ہوئے کہا، اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔

"کونسا پروگرام آرڈر ہوا ہے؟"، دلاور ناشتہ بھول کر بولا، اس کی نظریں پاشا پر گڑی تھیں، "اے، بی، یا ڈی؟"

"اے"

"اے!"، دلاور زور سے بولا، "اے؟! ابھی ہم 'سی' کو تکمیل تک پہنچا نہیں سکے ہیں، یہ "اے" کہاں سے نازل ہوگیا؟"

"اپنے ہینڈلر سے جاکر پوچھو"، پاشا نے جواب دیا۔

"مگر"، مشتاق ستے ہوئے چہرے کے ساتھ بولا، "ہینڈل نے اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی؟"

"بتائی ہے"، پاشا پلیٹ میں سے انڈہ صاف کرتے ہوئے بولا۔سب خاموش ہوگئے۔بابر کا دل دھڑکنے لگا، اگر یہ لوگ پریشان تھے تو یقیناً کوئی بڑی پریشانی ہوگی۔دفعتاً اس کے ذہن میں کھڑکی میں موجود اس سرخ نقطے کی تصویر ابھری، وہ سرخ بتی اور پھر اس کا بجھ جانا، وہ کچھ کہنے لگا مگر پھر خاموش ہوگیا۔

پاشا نے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مشتاق نے فوراً اٹھ کر اسے چائے سے بھر دیا۔ پاشا نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور آنکھیں بند کر کے انگوٹھے اور انگشت شہادت سے اپنی پیشانی دبانے لگا۔

"یہ چائے کس نے بنائی ہے؟" اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

"بابر نے"، دلاور نے جواب دیا۔

"اچھی بنائی ہے"، پاشا بابر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے لمبے لمبے گھونٹ لیکر چائے ختم کر دی اور کپ میز پر رکھ دیا۔

"اور؟"

"نہیں"، پاشا نے رومال سے اپنے ہونٹ پونچھتے ہوئے کہا، "شام چار بجے ڈاکٹر صاحب نے جنرل میٹنگ کال کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مشن اے بریف کریں گے اور اس کے لائحہ عمل کے لیے پولنگ ہوگی"۔

"مس نتاشہ بھی میٹنگ اٹینڈ کریں گی؟"، طارق بول اٹھا۔

"ہاں"، پاشا نے اٹھتے ہوئے کہا، "سب لوگ اپنی فیلڈ رپورٹس ساتھ لے کر آئیں، انھی کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا"۔

وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ بابر نے ناشتے کے برتن سمیٹے اور انھیں اٹھا کر نیچے لے گیا۔ برتن رکھ کر وہ جانے لگا مگر پھر مڑ کر اس نے سنک پر رکھا 'وم' کا ڈبہ اٹھایا اور برتن دھونے لگا۔

برتن دھو کر وہ واپس اوپر مشتاق کے کمرے میں پہنچا۔ مشتاق کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر مختلف ڈیٹا فائلیں ترتیب دے رہا تھا۔ بابر اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ مشتاق مائیکروسافٹ ایکسل کھولے سپریڈ شیٹس کی کاپیاں بنا رہا تھا، اور انہیں نئے ناموں سے سیو کر رہا تھا۔ اس کے ماؤس کی ٹک ٹک کے علاوہ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔

"پاشا صاحب........"، بابر کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"کیا؟"، مشتاق کمپیوٹر سے نظریں ہٹائے بغیر بولا۔

"پاشا صاحب جو کہہ رہے تھے.... خیریت ہے؟"

"ہاں ہاں! ابھی تو کوئی مسئلہ نہیں"۔

"آپ لوگوں کو کوئی بہت خطرناک مشن سونپ دیا گیا ہے؟"

"کہہ سکتے ہو"

بابر خاموش ہو گیا۔

"مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کا سیٹ اپ نیاء ہے"، مشتاق نے مسلسل کام کرتے ہوئے کہا، "ابھی صرف چار ماہ ہوئے ہیں اور اس میں ہماری کارکردگی بے حد اچھی رہی ہے اور اس کا یہ انعام ہمیں مل رہا ہے!" مشتاق سر ہلاتے ہوئے بولا، "ہر جگہ بیوروکریسی چھائی ہوئی ہے! حکومت کا ایک پرزہ اگر صحیح کام کرتا ہے تو باقی سب ناکارہ حصے اسے رگڑ رگڑ کر ختم کر دیتے ہیں! کم از کم اس سیٹ اپ کو چھ ماہ مزید درکار ہیں، اس کے بعد کچھ کرنے کرانے کا سوچنا چاہیئے تھا، پر نہیں! اب تو جوتیوں میں ہی دال بٹے گی!"

مشتاق کا رنگ سرخ ہونے لگا اور اس کی انگلی زور زور سے ماؤس پہ کلکنگ کرنے لگی۔

بابر کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا، "مشن ہے کیا؟!"

"بابر یہ پیچھے سے پرنٹر کی کیبل لگا دینا"، مشتاق بولا۔

بابر نے اٹھ کر پرنٹر کی کیبل کمپیوٹر کے ساتھ منسلک کر دی۔

"تم ایسا کرو لاؤنج میں جا کر ٹی وی دیکھو میں یہاں تھوڑا سا کام کر لوں"۔

بابر اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے وہ رکا اور مشتاق کی طرف پلٹا۔

"کیا بات ہے؟"، مشتاق نے ماؤس پر سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"اگر میں آپ لوگوں کے ساتھ شامل ہونا چاہوں تو.......؟"

مشتاق ہنس دیا۔ "اوہو!"، اس نے اپنی کرسی پیچھے دھکیلی، "اتنی جلدی ذہن

بنالیا! ابھی پرسوں تو ہم تمھیں اٹھا کر لا رہے ہیں!"، مشتاق ہنسا۔

بابر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ہو سکتے ہو"، مشتاق نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بابر کے لیے تحسین کے تاثرات ابھر آئے۔ بابر نے تائید میں سر ہلایا اور کمرے سے نکل گیا۔ مشتاق اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا جب ساتھ والے کمرے سے ٹی وی آن ہونے کی آواز آئی تو مشتاق نے کرسی کمپیوٹر کے آگے کھینچ لی اور سپریڈشیٹس پرنٹ کرنے لگا۔

بابر کے ذہن میں کوئی سہانے سپنے نہیں تھے۔ ماں باپ کا گھر پھولوں کی ایک سیج کی طرح تھا جس میں سے امی ابو نے کانٹے بڑی محنت سے چن لئے تھے تاکہ اسے صرف پتیوں کی نرمی محسوس ہو سکے۔ پچھلے تین دنوں نے اسے سکھا دیا تھا کہ وہ سیج محض ایک خواب کی طرح تھی۔ خود امی ابو جن کانٹوں پر سوتے جاگتے تھے اسے ان کا احساس ہونے لگا تھا، کیونکہ وہ خود زنگ آلود کیلوں پر چل رہا تھا۔

نہیں! اس کا ایف آئی اے والوں کے ساتھ ملنے کا فیصلہ کسی خوش فہمی کی بنیاد پر نہیں تھا۔

نہیں! کوئی ایکشن فلم اس فیصلے کی بنیاد نہیں تھی۔

نہیں! اس رستے پر چلنا آسان نہیں تھا۔

نہیں! یہ لوگ محب وطن نہیں تھے۔ یہ صرف عیاش اور مطلب پرست تھے۔

نہیں! کوئی اس کا دوست یار نہیں تھا۔

نہیں! صرف وہی چیز اچھی یا درست تھی جو اس دنیا میں فائدہ پہنچا سکے، جس میں نقصان ہو صرف وہ چیز بری یا غلط تھی۔

کیا اس کا بچپن ایک بھولا ہوا خواب تھا؟ کیا امی کی سچائی کے رستے پر چلنے کی باتیں الف لیلوی کہانیاں تھیں؟ اگر ایسی بات تھی تو ابو بھی تو بڑے ہوئے تھے، انہوں نے بھی تو اس دنیا کو دیکھا تھا، پھر ابو کیوں نہیں بدلے؟ وہ کیوں نہ اس مطلب پرستی کے رستے پر چلے؟ وہ بہت دیر تک اس سوال پر غور کرتا رہا۔

اس بیچ بہت کچھ ہوتا رہا۔ آج وہ سب بہت مصروف تھے۔ سب اپنی اپنی تیاریوں میں لگے تھے، یوں جیسے مکان شفٹ کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہوں۔ گاڑی سٹارٹ ہونے کی، کوٹھی سے نکلنے کی، پھر واپس آنے کی آواز کئی مرتبہ آئی۔ بھاگتے ہوئے قدم سیڑھیاں چڑھتے اترتے رہے۔ مشتاق کے کمرے میں فون کی گھنٹی کئی مرتبہ بجی، اور اس سب کے بیچ بابر بے چینی سے ٹی وی دیکھتا رہا۔ طارق دو ایک بار لاؤنج میں آیا اور اس نے اس طرح ہر چیز پر نظر دوڑائی جیسے وہ انگلیوں کے نشانات تلاش کر رہا ہو۔

کچھ چاہیے؟ بابر کے پوچھنے پر اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔ بابر نے سوچا کہ اٹھ کر ٹی وی بند کر دے مگر ٹی وی دیکھنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

جیسے جیسے دوپہر ڈھلتی گئی ان کی نقل و حرکت میں اضافہ ہوتا گیا۔ پورچ میں گاڑی ایک بار پھر آ کر رکی۔ کتے کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔ بابر نے لاؤنج کی کھڑکی پر سے پردہ اٹھا کر دیکھا، لان کے ایک کونے میں جیک بندھا تھا، اور لگ رہا تھا کہ صبح سے کسی نے اسے کھانا نہیں ڈالا تھا۔ وہ جبڑے کھولے، زبان لٹکائے اپنے غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ دفعتاً بابر کی نگاہ سامنے والے گھر کی کھڑکی پر پڑی تو اسے ایک آدمی کا سر نظر آیا۔ وہ ایک چہرہ تھا جس پہ گھنی مونچھیں اگی تھیں اور کھڑکی کی اوٹ میں سے دو آنکھیں پورے انہماک سے گاڑی سے اترنے والوں کو دیکھ رہی تھیں۔

باہر باجوہ اور پاشا کے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ باجوہ کچھ بات کرتے ہوئے لان میں آ گیا۔ جیک اسے دیکھ کر زور لگاتے ہوئے اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ باجوہ نے جیک کو پچکارا اور یکدم بابر کی نگاہیں سامنے کھڑکی میں موجود آدمی کی نظروں سی ٹکرائیں اور وہ آدمی ٹھٹھک گیا۔ ایک لمحے کے لیے بابر کو ان آنکھوں میں نفرت اور حقارت کی ایک چمک سی نظر آئی اور پھر وہ چہرہ غائب ہو گیا۔
بابر بے ساختہ کچھ کہنے لگا مگر پھر خاموش ہو گیا۔ لان میں باجوہ اکڑوں بیٹھ کر جیک کی

پیٹھ سہلانے لگا اور جیک ہانپتے ہوئے بابر کی طرف دیکھنے لگا۔
بابر نے پردہ گرا دیا۔ سامنے والے گھر میں موجود شخص کون تھا؟ کیا وہ ان کی جاسوسی کر رہا تھا؟ وہ اس نئے مسئلے پر سوچ بچار کرنے لگا۔
چار بج گئے اور ڈاکٹر صاحب آ گئے، ان کے ساتھ شاید کوئی اور بھی تھا۔ کوٹھی میں خاموشی چھا گئی اور لاؤنج میں بابر نے ٹی وی بند کر دیا۔ بابر کو محسوس ہوا کہ سب باہر کاریڈور میں موجود تھے۔ آہستہ آہستہ قدم سیڑھیاں چڑھنے لگے اور بابر کو محسوس ہوا جیسے کوئی نسوانی آواز اس کے کانوں میں پڑی ہو۔ چند لمحوں بعد خاموشی چھا گئی۔ بابر نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر آہستگی سے لاؤنج کا دروازہ کھولا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا بلکہ پورے گراؤنڈ فلور پر کوئی نہیں تھا البتہ اوپر والی منزل سے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مین دروازہ یقیناً لاک تھا۔ بابر تھک کر صوفے پر بیٹھ گیا۔
لاؤنج کا دروازہ اس نے کھلا رہنے دیا۔
ایک گھنٹہ گزر گیا۔ بابر کو گھر کی یاد ستانے لگی۔ امی کس حال میں ہوں گی؟ وہ سوچنے لگا۔ اسی اثناء میں مشتاق نیچے اتر آیا۔
"بور ہو رہے ہو شہزادے؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"بس ویسے ہی"، بابر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
"چلو ایک کام کرو۔ چار کپ چائے بنا کر لے آؤ"۔
"ٹھیک ہے"، بابر اٹھ کھڑا ہوا۔
"چائے بنا کر کپوں میں ڈال لینا میں آ کر لے جاؤں گا"، مشتاق نے واپس سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔
بابر نے تائید میں سر ہلایا اور کچن کی طرف چل دیا۔ چائے پکا کر اس نے کپوں میں ڈالی اور مشتاق کے نیچے اترنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد مشتاق کچن میں داخل ہوا۔
"ہاں بھئی چائے تیار ہے؟" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل"

مشتاق نے ٹرے اٹھائی اور چل دیا۔

"مشتاق؟"

مشتاق ٹرے اٹھائے واپس گھوما، "ہاں؟"

"میں گھر فون کرنا چاہ رہا تھا"

"بابر"، مشتاق مسکرایا، "تم جانتے تو ہو........"

"میں سب جانتا ہوں"، بابر نے آگے آتے ہوئے کہا، "اور میں تمھاری ہر بات سے اتفاق بھی کرتا ہوں، مگر یار ایک بار، ایک بار فون کر لینے دو!"

"یار میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت مشکل میں ہو مگر......."

"صرف ایک بار گھر اپنی آواز سنا لینے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں فوراً فون بند کر دوں گا!"

"بابر میں مجبور ہوں!"

"مشتاق، ایک بار!"، بابر کی آواز بھرا گئی۔

مشتاق بابر کو دل سے پسند کرنے لگا تھا۔ بابر کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جس نے کیو روم کے دروازے میں ٹکریں مار کر انھیں ڈرا دیا تھا۔ قسمت کے کس دھارے نے اسے یہاں پہنچا دیا تھا؟!

"آجاؤ"، مشتاق خاموشی سے بولا۔

بابر اس کے پیچھے چل دیا۔

"اگر ضیاء صاحب یا اور کسی کو پتہ چل گیا کہ میں نے تمھیں فون کروایا ہے تو وہ مجھے جان سے مار دیں گے"، مشتاق نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

بابر کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

وہ مشتاق کے کمرے میں آ گئے۔ کمپیوٹر کے ساتھ سرخ رنگ کا فون سیٹ پڑا تھا۔

"فون کر لو"، مشتاق نے سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا، "مگر زیادہ بات نہ کرنا اور نہ ہی یہ بتانا کہ تم یہاں ہو اگر کوئی یہاں تمھارے پیچھے پہنچا تو تمھاری خیر نہیں ہو گی!" مشتاق جانے لگا۔

"مشتاق! شکریہ!"

مشتاق نے جاتے ہوئے سر ہلا دیا، "فون جلدی بند کر دینا"، اس نے تنبیہ کی۔ کانپتے ہاتھوں سے بابر نے ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کیا۔ ابھی پہلی گھنٹی پوری طرح سے بجنے بھی نہ پائی تھی کہ دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"اجی کچھ پتہ چلا؟"

بابر کے پیروں تلے زمین آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔

"اجی کچھ پتہ چلا بابر کا؟"

دیواروں کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ اس کے کان کے ساتھ لگے ریسیور کی ٹھنڈک سے اس کے گالوں میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔

"اجی آپ بولتے کیوں نہیں؟ کہاں ہیں آپ؟"

"امی جی"، اس کی روح کے کنوئیں میں سے آواز نکلی۔

دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔

"بابر؟!"، دوسری طرف سے عجیب سی بھرائی ہوئی آواز آئی۔

"بابر؟!"، اس کی ماں بولی۔

"بابر!!"، اس کی ماں چیخی۔

"بابر!!!"، اس کی ماں چلائی، "بابر!!!"

"امی جی میں......."

"بابر!! ہائے اللہ جی بابر!! بابر!!"

"امی جی میں ہوں"

"بابر گھر آجا میرے بچے! گھر آجا بابر!"

"امی جی میں آؤں گا!"

"بابر گھر آ جا!"، اس کی والدہ رونے لگی، "گھر آ جا!"، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"امی جی!"، بابر کے اپنے آنسو بہنے لگے، "مت روئیں"

"تو کہاں چلا گیا ہے؟ کیوں چلا گیا ہے ہمیں چھوڑ کے؟!"

"امی جی میں کہیں نہیں گیا! میں یہیں ہوں!"

"میرے کلیجے سے آ کر لگ جا میرے بچے! تو کیوں مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے؟!"

"امی جی میں کہیں نہیں گیا!"

"تو گھر آ جا بابر!"

"میں......"

اس کی والدہ زاروقطار رونے لگیں، بابر کی بھی ہچکی بندھ گئی۔ سسکیاں لیتے لیتے اس کا گلا ندھ گیا اور بینائی پر آنسو چھا گئے۔

"بابر!"، ایک مدت بعد اس کی والدہ کی آواز آئی، "بیٹا گھر آ جا۔ کوئی تجھے کچھ نہیں کہے گا!"

"امی جی!"

"بیٹا تجھ سے کوئی سوال جواب نہیں ہوں گے! ہم تیرے مجرم ہیں....."

"امی جی نہیں!"

"تو معصوم ہے میرے لال! یہ دنیا بڑی ظالم ہے تو کیوں اس سے اکیلے لڑنے نکل پڑا ہے؟!"

بابر کا کلیجہ چاک ہو گیا۔ "امی جی!"، اس کا دل چاہا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روئے مگر اسے خاموشی کا خیال رکھنا تھا۔

"تو معصوم ہے میرے بچے! تجھے تو کبھی گرم ہوا نہیں لگی تو کیوں اس جہنم

میں نکل کھڑا ہے؟!"

بابر اس قابل نہ رہا تھا کہ کوئی جواب دے سکے۔ دونوں ہاتھوں سے رسیور تھامے وہ اپنی والدہ کی آواز کو سننے لگا۔

"غصہ تھوک دے میرے بچے! تھوک دے غصہ اور ہمارے دل سے آ کر لگ جا تو تو ہمارا چاند ہے!"

بابر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے کان سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں پر وہ دونوں ہاتھوں سے رسیور دبائے اپنی ماں کی باتیں سننے لگا۔

"بیٹا....."

"امی جی بس!" وہ منہ سے بہتی رال صاف کرتے ہوئے رویا، "اور کچھ مت بولیں میں مر جاؤں گا!"

"بیٹا!"

"میں مر جاؤں گا امی جی میں مر جاؤں گا!"

"نہ میرے لال تجھے ہماری زندگی بھی لگے تو بس اب گھر آ جا"

"امی جی میں ضرور آؤں گا!"

"کب؟"، اس کی والدہ دھڑکتے دل کے ساتھ بولی۔

"بہت جلد، بہت جلد"

"تو کہاں ہے؟"

"میں یہیں ہوں لاہور میں"

"پر تو ہے کہاں؟!"

"میں بس یہیں ہوں"

"تو بس ابھی گھر آ جا! یہاں ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا ہے!"

"امی جی میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں میں بہت جلد گھر آؤں گا!"

"تو کسی مشکل میں تو نہیں ہے؟!"

"نہیں نہیں! بالکل نہیں"

"سچ بتا؟"

"نہیں نہیں! امی جی! میں بالکل ٹھیک ہوں"

"تو تو کیا کر رہا ہے بیٹا؟ کس حال میں ہے؟ میں تو پاگل ہوئی جا رہی ہوں"

"امی جی بس .... بس ٹھیک ہوں اور انشاء اللہ بہت جلد گھر آ جاؤں گا"

"کب؟"

"ایک دو دن تک"

"ایک دو دن!!!"

"امی جی میرا یقین کریں! میرے بس میں ہو تو میں ابھی اڑ کر آپ کے پاس آ جاؤں پر یہاں کچھ کام ہیں...."

"بیٹا تو ٹھیک تو ہے ناں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں!"

"ہر سیکنڈ جان کو عذاب ہے مجھے تو نیند ہی نہیں آتی......"

"امی جی امی جی صبر کریں!"

اس کی والدہ سسکیاں لینے لگی۔

"امی جی؟"، بابر نے پوچھا، "ابو کہاں ہیں؟"

"وہ تجھے ہی ڈھونڈنے نکلے ہیں!"

بابر خاموش رہا۔

"کل سے تجھے ڈھونڈ رہے ہیں، تیرے سب دوستوں سے پوچھا، ہر جگہ تیرا پتہ کیا، سب سے پوچھا۔ آج صبح تھانے میں رپٹ درج کروائی ہے، طاہر بھی ان کے ساتھ ہی ہے۔ وہ کل سے کرسی پر نہیں بیٹھے، ساری رات کھڑے ہو کر گزاری ہے، کچھ کھایا نہیں اور ابھی بھی تجھے ہی ڈھونڈنے گئے ہیں!"

"ابو سے کہیں گھر آ جائیں"، بابر بولا، "میں گھر آ رہا ہوں"

"آ جا میرے بچے! ابھی آ جا!"

"بس آپ تھوڑا سا صبر کریں اور میرا انتظار کریں، میں آ رہا ہوں"

"ہائے اللہ تیرا شکر ہے، تیرا شکر ہے مالک میرا بیٹا مل گیا! میں ہزار منتیں پوری کروں گی، دس دن تک غریبوں کو کھانا کھلاؤں گی! الٰہی میرا بیٹا مجھ تک خیریت سے پہنچا دے!"

"امی جی میں آ رہا ہوں، اب مجھے جانا چاہیے......"

"نہیں بیٹا....."

"امی جی میں کہیں نہیں جا رہا میں یہیں ہوں بس ابھی مجھے کچھ کام ہے....."

"کونسا کام؟!"

"آپ......."

اس بیچ کسی تیسرے آدمی نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو؟"، مشتاق کی آواز آئی۔ بابر اور اس کی والدہ خاموش ہو گئے۔

نمبر ڈائل ہونے کی ٹون بابر کے کان میں گونجنے لگی۔ ذرا توقف کے بعد مشتاق نے ریسیور کان سے ہٹا کر اوپر کمرے میں کسی سے بات کی۔

"سر لائن ابھی بزی جا رہی ہے، کچھ دیر ٹھہر کر ٹرائی کرتا ہوں"

"ٹھیک ہے"، بابر کے کان میں ایک اجنبی آواز پڑی۔

"بابر فون رکھ دے"، مشتاق ریسیور ہونٹوں سے لگا کر پھنکارا اور پھر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا، مگر ریسیور صحیح طرح سے نہ رکھا گیا، کیونکہ دوسری طرف سے باتوں کی آوازیں بابر کو آنے لگیں۔

"بیٹا یہ کون تھا؟"، بابر کی والدہ حیرت زدہ لہجے میں بولی۔

"امی جی یہ .... یہ دوست تھا اور اب مجھے دیر ہو رہی ہے مجھے جانا ہے، خدا حافظ!" یہ کہتے ہوئے بابر نے ریسیور رکھ دیا۔

"بچ گئے!" اس نے سوچا، اور پھر ماں کی باتیں اس کے ذہن میں اپنے

آپ کو دہرانے لگیں اور وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگا۔

اسی طرح چند منٹ گزر گئے۔ بابر نے اپنے آنسو پونچھے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھے یہاں سے نکلنا ہے،" وہ سوچنے لگا، "کتنے دن مجھے یہاں رکھیں گے؟ اب تو ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو گیا ہے!"

وہ مشتاق کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بے دلی سے اس نے سوچا کہ کمپیوٹر پر سولیٹائر لگا لے پر اسے اس خیال سے ہی نفرت ہونے لگی۔ اس کی نگاہ واپس فون پر پڑی اور دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس فون کی ایک ایکسٹینشن اوپر بھی کسی کمرے میں تھی جہاں اس وقت وہ سب جمع تھے۔ اسے یاد آیا کہ انھیں کوئی بہت ہی خطرناک مشن سونپا جانے والا تھا۔ اس کی توجہ خود بخود فون کے ریسیور پر مرکوز ہو گئی۔

"فون اٹھاؤں؟"، اس کے ذہن میں سوال اٹھا۔

"میرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟!"، اس نے سوچا، "پہلے ہی بڑی مشکل سے بچا ہوں!"

"لیکن سننا تو چاہئے کہ اوپر کیا باتیں ہو رہی ہیں"

"فون اب ٹھیک طریقے سے رکھا گیا ہو گا، اور اگر میں نے فون اٹھایا اور ادھر ضیاء کسی اور سے بات کر رہا ہوا تو پھر کیا ہو گا؟!"، بابر مشتاق کی کرسی سے اٹھ گیا، "ایسی فضول حرکتوں کی وجہ سے آج میں یہاں تک پہنچا ہوں"، وہ سر ہلاتے ہوئے کمرے سے جانے لگا۔ بایاں پاؤں اٹھاتے ہوئے وہ گھوم کر پلٹا اور فون کا ریسیور جھپٹ کر اس نے کان سے لگا لیا۔

دوسری طرف کا ریسیور ابھی بھی صحیح طرح نہ رکھا گیا تھا اور ایک گرما گرم بحث کی آواز اس کے کان میں پڑنے لگی۔ وہ دم سادھے سننے لگا۔

"انیس سو چھہتر کا ٹرائل بھی انھی وجوہات کی بناء پر ناکام ہوا تھا،" ضیاء کی باریک آواز پھٹتی ہوئی اس کے کان میں پڑی۔ وہ بہت زور لگا کر بول رہا تھا۔

"کیا ہم تاریخ سے کچھ سیکھ نہیں سکتے؟ کیا ہر بار سب کچھ بھسم کر کے ہی ہم چین لے سکتے ہیں؟"

"تاریخ سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے مسٹر ضیاء"، بابر کے کان میں ایک ہلکی سی نسوانی آواز پڑی اور وہ سانس روک کر دوسرا کان انگلی سے بند کرتے ہوئے اس پر دھیان دینے لگا۔

"جس سیٹ اپ کا تمام تر کریڈٹ آپ لے رہے ہیں، مت بھولیئے کہ اس کو بیک کرنے والے ہم ہیں۔ آپ کے اور ڈاکٹر صاحب کے تیار کردہ سٹرکچرل پلان پر ہائی کمانڈ سے "نو شو" کے آرڈر جاری ہوئے تھے مگر ہم نے اسے بیک کیا......"

"جس پر ہم نے آپ کو رزلٹ شو کیئے،" ضیاء نے بات کاٹی، "اس ملک میں کام کرنے والا کونسا فنکشنل یونٹ ایسا ہے جس کا ٹریک ریکارڈ ہم سے بہتر ہو، اور اب جو آپ پلان "اے" کی بات کر رہی ہیں اس سے ہماری پوری ٹیم کامپرومائز ہوتی ہے!"

"آپ خود ہی اپنی باتوں کو کانٹراڈیکٹ کر رہے ہیں،" نسوانی آواز طنزیہ لہجے میں بولی، "اگر آپ لوگ اتنے ہی سیکیور ہیں تو پھر آپ کو کس چیز کا ڈر ہے"۔

"بات ڈرنے کی نہیں ہے مس نتاشا"، ایک نئی آواز بابر کے کان میں پڑی یہ یقیناً ڈاکٹر صاحب ہیں، بابر نے سوچا اور پھر دھیان سے سننے لگا۔

"........ پرسنل ایشو نہیں ہے۔ ہم فیکٹس کو سامنے رکھ کر چلتے ہیں، فیکٹس کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر تھیورٹیکل بحث میں پڑنے کی بجائے آن گراؤنڈ ریلیٹی کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ہمیں اسے مسئلے کو پریکٹیکل پوائنٹ آف ویو سے اپروچ کرنا چاہیے"۔

"بحث میں تو آپ لوگ پڑ رہے ہیں ڈاکٹر صابر۔ ہم نے تو آپ کو صرف فیکٹس سے آگاہ کیا ہے۔ مجھے کوئی شوق نہیں کہ میں ایمبیسی سے نکل کر، اپنی پوزیشن کامپرومائز کر کے، یہاں بیٹھ کر آپ کے جونیئر ان کمانڈ کے ساتھ اپنا سر کھپاؤں۔

بحث ختم کیجئے جنٹلمین،" وہ تحکمانہ انداز میں بولی"، اس آؤٹ فٹ پر ہم نے اپنا بہت سا قیمتی وقت اور پیسہ انوسٹ کیا ہے، اب ہمیں رزلٹ چاہئیں۔ پلان اے فائنل ہے اور رہے گا، بہتر ہوگا کہ اب اس کے عملی پہلو پر بات کر لی جائے"۔

"یہی لیکچر آپ نے بی ٹیم کو سنایا ہوگا"، ضیاء کی غصے سے کانپتی آواز آئی۔

"ضیاء!" ڈاکٹر صابر کی تحکمانہ آواز آئی،" مس نتاشا ہماری ہینڈلر ہیں، آرڈر آرڈر ہوتا ہے، اس کی نفی بے سود ہے۔ اب ہمیں مزید وقت برباد کرنے کی بجائے آپریشنل ڈیٹیلز مس نتاشا کے سامنے رکھنی چاہئیں۔"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ بابر نے سوچا کہ اب فون رکھ دینا چاہیے۔

"پہلا بلاسٹ جنرل بس سٹینڈ پر ہوگا"، ضیاء کی فیصلہ کن آواز آئی اور بابر نے یوں حیرت سے جھٹکا کھایا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔

"دوسرا دھماکہ پھر وہیں شام کے وقت کیا جائے گا"، ڈاکٹر صابر کی آواز آئی۔

" مگر اس سے لاہور سکیورٹی بلیکنٹ میں آجائے گا"، نتاشا بولی،" ہر فورس ریڈ الرٹ ہو جائے گی"۔

"یہی تو ہم آپ کو سمجھانا چاہ رہے تھے مگر خیر .... مشن بریف میں پانچ دھماکے سپیسیفائی کیئے گئے ہیں، دو دھماکے ہم کالجوں میں کریں گے"۔

"اور آخری بلاسٹ؟"

" آخری بلاسٹ یہیں پر، اس گھر میں"

" کیا؟" نتاشا حیرت زدہ ہوئی۔

"جی ہاں، یہیں پر، اسی گھر میں"، ضیاء نے جواب دیا۔

" مگر کیوں؟"

" آپ کے یہاں آنے سے پہلے ہم تمام تر ڈیٹیلز فائنل کر چکے ہیں"، ڈاکٹر

صابر کی آواز آئی،" کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہم آپ کا ذہن بدل نہیں پائیں گے اور پلان اے ہم پر مسلط رہے گا، لہٰذا ہم اس کا مکمل ایکشن ڈرا کر چکے ہیں"۔

" مگر آپ اپنا یہ بیس کیوں تباہ کرنا چاہتے ہیں؟ کیا یہ عقلمندی ہے؟ اس سے کیا فائدہ ہوگا، بہت سرمایہ صرف ہوا ہے اس پر!"

"مس نتاشا آپ سرمائے کی بات نہ کریں۔ آپ کو رزلٹ چاہئیں، وہ آپ کو مل جائیں گے۔ پہلے چار دھماکے کرنے کے بعد ہماری پوزیشن کامپرومائز ہو جائے گی۔ ہمارے پاس ایک ہی سفید رنگ کی گاڑی ہے اور چار فیلڈ ایجنٹ ہیں۔ چاروں جگہ پر یہ گاڑی اور یہ چار آدمی دیکھے جائیں گے۔ ہماری حتی الوسع یہ کوشش ہوگی کہ کسی کو بھی ان پر شک نہ ہو، مگر میتھمیٹیکل پرابیبلٹی کے حساب سے یہ بات ہمارے حق میں نہیں جاتی اور کسی نہ کسی طریقے سے ہو سکتا ہے کہ ہمارے آدمیوں کے حلیئے، گاڑی کا نمبر یا آدمیوں کی تعداد کا علم ایجنسیوں کو ہو جائے۔ ہمیں امید ہے ایسا نہیں ہوگا، بہر حال ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔ آخری بلاسٹ اس گھر میں ہوگا، جس میں اس گھر کے سابقہ مکین مارے جائیں گے اور ساتھ ہی ہمارے خلاف جو بھی شواہد ہوں گے، ہمارے موبائل فون تک اس دھماکے میں بھسم ہو جائیں گے۔ پھر ہم چار چھ ماہ تک علیحدہ علیحدہ انڈر گراؤنڈ رہیں گے اور یہ سیٹ اپ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد اگر آپ کو ہماری ضرورت رہی تو آپ مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں"۔

" کیا یہ سب ضروری ہے؟" نتاشا ابھی تک حیرت زدہ تھی یا پھر وہ سوچ رہی تھی کہ اس سے اسے کتنا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

کسی نے اسے جواب نہ دیا۔

"او کے"، وہ بولی،" پہلا بلاسٹ کب ہوگا؟"

" کل"

" کل؟!!!" نتاشا کا آج یوم حیرت تھا۔

"مس نتاشا آپ کو ہی تو جلد از جلد رزلٹ چاہیے تھے"، ضیاء کی طنزیہ آواز آئی۔

"کوئی غلطی نہ کر بیٹھیے گا آپ لوگ"

"مس نتاشا، یہ کہنا آپ کو زیب نہیں دیتا"

"نہیں میرا مطلب تھا کہ...... آپ نے اتنی جلدی ارینجمینٹس کر لیئے؟"

"جی ہاں، پہلا دھماکہ کل صبح گیارہ بجے جنرل بس سٹینڈ پر ہوگا، دوسرا شام سات بجے پھر وہیں ہوگا"

" مگر..... آپ لوگ دانشمند ہیں....... مگر کیا اس طرح آپ کے آدمی نظروں میں نہ آجائیں گے؟"

"ایک مصلحت کے تحت دونوں بلاسٹ ایک ہی دن کے لیے پلان کیئے گئے ہیں"

"اور وہ کیا ہے؟"

"ہمارے پاس ایک پوٹینشل رنگروٹ آیا تھا، مگر اب وہ لڑکا ہمارے لئے بیکار ہے۔ پہلا بم وہ لے کر جائے گا"

" کون ہے وہ؟"

"ایک لڑکا ہے بابر نام کا جسے ہمارے آدمیوں نے ہیروئن کیس بنا کر ٹریپ کیا ہے"

"غالباً یہ لڑکا مشتاق بھی آپ لوگوں کے پاس ایسے ہی کسی کیس میں آیا تھا"۔

"جی ہاں، مگر مشتاق اب ہمارا با اعتماد ساتھی ہے لیکن یہ لڑکا خود سر ہے اور ہمارے لئے لائیبلیٹی بن چکا ہے۔ ضیاء کی رپورٹ کے مطابق ہم اس پر دباؤ ڈال کر اس سے کام نہیں لے سکتے۔ اپنی اپنی فطرت ہوتی ہے۔ بحیثیت ڈاکٹر میں نے لڑکے کی رپورٹ کا معائنہ کیا ہے اور میں اس میں کوئی کمزوری محسوس نہیں کر سکا جس کو مرکز بنا کر ہم اسے اپنے لئے کام کرنے پر مجبور کر سکیں۔ اس کے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔ وہ ذہین ہے اور میں دلی طور پر اس کی ہمت کی قدر کرتا ہوں۔ ایف آئی اے کے بہروپ میں ہمیں دیکھنے کے بعد اور ہیروئین کے ساتھ پکڑے جانے کے باوجود

اس کی ہمت نہیں ٹوٹی۔ ہمت توڑ کر ہی ہم ایسے لڑکوں سے کام لیتے ہیں، انھیں دہشت گرد بناتے ہیں۔ انہیں بیرون ملک سمگل کرتے ہیں مگر اس لڑکے کو کچلا نہیں جا سکتا۔ مجھے اس طرح اس کے ضائع ہونے پر افسوس ہوگا لیکن پہلے دھماکے کے لیے یہی لڑکا موزوں رہے گا۔"

"یہ دانشمندی ہے اور اس طرح سے آپ کے آدمی بھی منظر عام پر نہیں آئیں گے۔ باقی چار دھماکوں کے لیے بھی آپ یہ حکمت عملی کیوں نہیں اپناتے؟"

"اب یہ ممکن نہیں۔ اول تو وقت بہت کم ہے، گھر سے بھاگے ہوئے لڑکوں کو سدھانے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس سپلائر گینگ سے ہمارا رابطہ تھا وہ اب ہمارے لیئے لائیبلیٹی بن چکا ہے۔ ان کا ایک آدمی جس نے ہمیں یہ لڑکا سپلائی کیا تھا، ایجنٹ باجوہ کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔ باقی گینگ کو ہم کل کے آپریشن میں ختم کر دیں گے"۔

" کیا یوں بدلہ لینا دانشمندی ہے؟"

"وہ ہمیں بلیک میل کر رہے ہیں۔ لڑکوں کی قیمت بڑھا رہے ہیں، ان کے آدمی چھیکو نے از خود ہمارے ایجنٹس کو دھمکایا جس پر اسے موقع پر ہلاک کر دیا گیا۔ ایسے گروپوں کی کمی نہیں ہے مگر ہمیں ایک مثال قائم کرنی ہے۔ خیر ہم اصل موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔ اب صرف یہ طے کرنا باقی رہ گیا ہے کہ دھماکہ بس سٹینڈ پہ کیا جائے یا اس بس میں جس میں لڑکے کو سوار کیا جائے گا"

"اوہ! یہ بہتر ہوگا!"

"ضروری نہیں ہے، اس سے ہمارا شام کا ٹارگٹ کامپرومائز ہو سکتا ہے، بہرحال یہ ڈیٹیل بھی آج ہی فائنل ہو جائے گی"

" آپ کی جو بھی پلاننگ ہے اس سے آپ مجھے ابھی آگاہ کریں کیونکہ پہلے دھماکے کے بعد ہماری ایمبیسی کی ایسی کڑی نگرانی شروع ہو جائے گی کہ میں آپ کو ہینڈل نہیں کر سکوں گی"

"یہ آپریشنل ڈیٹیل ہے اور اس سے آپ کا کوئی کنسرن نہیں، آپ پیمنٹ کی بات کریں"

"پیمنٹ آپ کو وایا کریڈٹ کارڈ ہو جائے گی، ہمیشہ کی طرح"

"مس نتاشا ایک اور ضروری بات، جو کہ میں بھول رہا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ڈیناٹیبل آپریشن ایکٹ کے تحت جو پیمنٹ آپ نے بی ٹیم کو کرنی تھی، وہ ٹیم کا مپرومائز ہو جانے کے بعد آپ نے نہیں کی"

"ہاں، تو؟!"

"وہ پیمنٹ آپ ہمیں بونس کے طور پر کریں گی"

"کیا؟!"، نتاشا پھٹ پڑی، "امپاسیبل!"

"بالکل پاسیبل ہے مس نتاشا"

"آپ لوگ حد سے بڑھ رہے ہیں!"

"غلط! حد سے تو آپ بڑھ رہی ہیں"، ڈاکٹر صابر پھنکارا، "میں نے اس ملک میں منشیات اور دہشت گردی کا ایسا وسیع جال پھیلانے کی پلاننگ کی تھی کہ حکومت پاگل ہو جاتی! مگر اب آپ کی وجہ سے مجھے نئے سرے سے سٹارٹ لینا پڑے گا۔ اس ملک کے نوجوانوں کے ذہن مسلسل پست حالی سے اسقدر زہر آلود ہو چکے ہیں کہ ایک دن یہی زہر اس ملک کی دھجیاں اڑا دے گا! مجھے اس دن کا انتظار ہے مگر آپ لوگوں میں صبر نہیں ہے، یہ چھوٹے چھوٹے دھماکے آپ اور آپ کے سیاستدانوں کے لیے زیادہ اہم ہیں، مگر......!!"

خاموشی چھا گئی۔

"اب آپ کا کیا خیال ہے مس نتاشا؟"، ضیاء نے اسے چھیڑا۔

"میرا تو خیال ہے کہ یہ مشن ڈراپ ہو جاتا تو بہتر تھا، یہ مجھے بہت مہنگا پڑ رہا ہے"

اس بار سب کھل کر ہنس پڑے۔

"ڈاکٹر صاحب میری رسیونگ ہیڈ بات کروایئے"

"مشتاق فون ملاؤ"

کرسی گھسٹنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی بابر نے رسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ خون کی تیز گردش سے اس کا چہرہ سرخ پڑنے لگا۔ نجانے کس وقت اس نے زبان دانتوں میں دبالی تھی اور اب زبان میں سے خون رسنے لگا اور اس کا منہ لعاب اور لہو سے بھر گیا۔

بابر مشتاق کے کمرے سے نکل کر بھاگا۔ کاریڈور سے نکل کر پھسلتے ہوئے وہ لاؤنج کے دروازے سے آ لگا۔ لاؤنج خالی تھا اور اوپر جانے والی سیڑھیوں میں بھی کوئی نہیں تھا۔ سامنے مین دروازہ تھا۔ بابر بھاگا۔ دروازے کو وہ کسی پرندے کی طرح پار کر جانا چاہتا تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رکا مگر چکنے فرش پر اس کے قدم پھسلے اور وہ ایک دھماکے سے دروازے سے جا ٹکرایا۔ باہر کرسی گھسٹنے کی آواز آئی، پیچھے ہٹ کر اس نے پوری قوت سے ہینڈل گھما کر دروازہ اندر کھولا اور جونہی اس نے قدم باہر نکالا باہر کھڑے طارق نے اس پر پستول تان لی۔

"کیا کر رہا ہے تو؟"، طارق پستول کی لبلبی پر انگلی رکھتے ہوئے غرایا۔ بابر نے پستول کی نالی میں جھانکا اور پھر طارق کی آنکھوں میں دیکھا۔ طارق سے منہ موڑتے ہوئے اس نے زمین پر تھوک دیا۔ تھوک کا نشان پان کے داغ کی طرح سرخ تھا۔

"کیا ہوا ہے تجھے؟"، طارق نے نشان دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ پستول اس نے مسلسل بابر کے سینے پر تانے رکھی۔

بابر نے کچھ کہے بغیر ایک بار پھر زمین پر تھوک دیا۔ درد سے اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا اور پانی نے دھکتے جذبات کی آنچ کو ڈھانپ لیا۔ اس کی ایک ٹانگ کانپنے لگی۔

"منہ کھول"

"زبان کٹ گئی ہے"، بابر نے ایک بار پھر تھوکتے ہوئے کہا۔

"دروازے میں لگنے سے؟"

بابر نے تائید میں سر ہلا دیا اور اس کی نظریں کوٹھی کے گیٹ کی طرف اٹھ گئیں۔

طارق ہنس دیا۔ پستول اس نے نیفے میں اڑس لی۔

"ہاں، کاریڈور کے فرش پر تھوڑی سی پھسلن ہے"، وہ بولا، "سالا ٹھیکیدار کتے کا بچہ ہے! زیادہ تو نہیں کٹ گئی؟"

بابر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"چلو اچھا ہے"، طارق ہنسا، "زبان کی پٹی بھی نہیں ہو سکتی، آ جا، باتھ روم میں پائیوڈین پڑی ہے اس سے کلی کر لے"۔

"میں کر لیتا ہوں"، بابر نے اسے روکا اور واپس کوٹھی کے اندر چل دیا۔ اس کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ تیز تیز چلتے ہوئے مشتاق کے کمرے کے ساتھ ملحقہ غسلخانے میں پہنچ کر اس نے دروازے کو کنڈی لگا لی اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

سامنے شیشہ تھا اور اس کے عکس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، منہ کھلا ہوا اور ہونٹوں کے کنارے سے خون آلود لعاب رس رہا تھا۔

"او خدایا!"

"نہیں نہیں!"، وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

"منہ صاف کرنا چاہیے"

"ہاں ہاں!"

پانی کھول کر وہ بار بار کلّی کرنے لگا۔ سرتاپا وہ پسینے میں شرابور ہونے لگا۔ اس نے منہ دھویا، گردن دھوئی، بال دھوئے مگر اندر کی حدت جیسے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں اور وہ کانپنے لگا۔

"اف خدایا اتنی سرخ آنکھیں"، ایک کپکپاتی انگلی سے اس نے شیشے کو چھوا۔ اس نے پلکیں جھپکیں اور آنکھوں کے پھولتے ہوئے سرخ ڈورے پلکوں سے ٹکرائے۔

اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو بری طرح کانپنے لگے تھے۔ تجربے کے طور پہ اس نے ایک ہاتھ ٹونٹی پہ رکھا مگر وہ پھسل کر گر گیا۔

"میں کیا بن گیا ہوں؟!"

اس کی آنکھوں کے آگے پٹاخے سے چھوٹنے لگے اور پیشانی پہ رگیں ابھر آئیں۔ اس کا سر پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ اس نے کہنیاں سنک کے کناروں پہ ٹکائیں اور آگے جھک کر پیشانی ٹونٹی پر رکھ دی۔ پانی کی دھار اس کے ڈھیلے ہاتھوں میں پڑنے لگی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کی دنیا میں صرف پانی کا شور تھا۔ حدت کی لہریں تھیں جو کبھی اس کی پنڈلیوں سے چڑھتے چڑھتے اس کے کانوں کو گرما دیتیں، یا پھر اس کے سر کے گرد چکر کاٹ کر، بازوؤں سے ہو کر ہاتھوں کے رستے پانی میں اتر جاتیں، اور بس.......! اور کچھ نہیں تھا.......! یا پھر ایک ٹھنڈا ستارہ تھا جو اس کی پیشانی کے عین درمیان اسے سکون پہنچا رہا تھا۔ جہاں اس نے پیشانی ٹونٹی پہ ٹکائی ہوئی تھی۔

بس.......!

حدت اور ٹھنڈک.......!

حدت اور ٹھنڈک.......!

دنیا سمٹ کر صرف انھی دو احساسات تک محدود ہو کر رہ گئی تھی یا پھر پانی کی دھار کا ساز، جو اسے لوری سنا رہا تھا۔ پانی سنک کے نیچے لگے پائپ میں اتر رہا تھا اور پائپ مزے سے کلکاریاں کر رہا تھا۔ بہتا پانی اس کی انگلیوں میں سے ہوتا ہوا پائپ میں اتر رہا تھا۔

بابر چکرا کر فرش پر گرا۔ فرش بے حد ٹھنڈا تھا۔ اس کے حلق سے سرور کی ایک آہ سی نکل گئی۔ ٹھنڈک! اس کا بدن تپ رہا تھا۔

اس نے پلٹ کر اپنا گال فرش پر لگا دیا اور سرور سے بے اختیار کراہ اٹھا۔ اس کے تپتے گال میں ٹھنڈی ٹھنڈی سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ اس کے ہونٹوں پہ ایک

مسکراہٹ سی پھیل گئی اور جی چاہا کہ بس وقت یہیں رک جائے اور پھر دماغ کے سرخ اندھیروں میں ماں کا چہرہ ابھر آیا۔

"امی شکرانے کے نفل ادا کر رہی ہوں گی"

"آخ!"

ایک جھٹکے سے اس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ تڑپ کر اٹھ گیا، پھر ایک جھٹکے سے وہ کھڑا ہوا۔ ٹونٹی کھلی تھی اور پانی مسلسل بہہ رہا تھا۔ اس نے شیشے میں دیکھا۔

"کیا میں آخری بار خود کو دیکھ رہا ہوں؟"

اس نے تڑپ کر آنکھیں پھیر لیں۔ دوسری طرف کموڈ تھا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ ایک بند نالی کی طرح تھا جس میں کچھ کچرا پھنسا تھا جو سوچوں کو بہنے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اس بات کا شکر ادا کیا۔

"یہ کفارہ ہے میرے گناہوں کا"

وہ آگے پیچھے جھولنے لگا۔

"ہاں، میری اٹھارہ سالہ زندگی کے گناہوں کا کفارہ"

"کفارہ نہیں، سزا!"

"میری کونسی بات خدا کو اتنی بری لگی؟!"

"یا اللہ میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں! اس لیئے نہیں کہ میری موت ٹل جائے بلکہ اس لیئے کہ تو مجھے معاف کر دے!"

"میری موت!"

"بڑا زبردست نام ہے۔ کسی فلم کا ہو تو بہت چلے!"

"ہیرو کون ہوگا؟"

"میں!"

وہ ہنسنے لگا۔ اس نے دانت چبائے مگر وہ ہنسنے لگا۔

"یار یہ سب کچھ اصلی ہے؟" غسلخانے کی دیوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

اس نے خود سے سوال کیا۔

"نہیں! میں کسی پاگل خانے میں بند ہوں۔ میں پاگل ہوں، ابھی نرس آئے گی مجھے ٹیکا لگانے کے لیے"

وہ آنکھیں بھینگی کر کے گردن ٹیڑھی کر کے آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ پاگل ایسے ہی ہنستے ہوں گے.......اور پھر اٹھ کر اس نے پوری قوت سے الٹے ہاتھ کا تھپڑ دیوار پر دے مارا!

"اف!"، وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ کو مسلنے لگا،" مگر یہ درد تو اصلی ہے!"

"بالکل اصلی ہے۔ اف خدایا! اس میں کوئی شک نہیں!"

"پھر یہ لوگ بھی اصلی ہیں"

"قاتل! قاتل! انھوں نے چھیکو کو قتل کر دیا"

"اور ہنس چھیکو! اور ہنس، ظالم تجھے تو تیرے کیئے کا بدلہ مل گیا مجھے تو نے کدھر پھنسا دیا؟!"

"وہ مر چکا ہے! وہ اب نہیں ہے! اور پرسوں میں اس سے ملا تھا!"

"میں بھی آج ہوں، کل نہیں ہوں گا!"

"نہیں!" وہ غرایا۔ خوف کی جگہ طیش لینے لگا۔

"دہشت گرد!"

"معصوموں کا خون بہانے والے!"

"ان میں سے ہر ایک کو زمین میں زندہ گاڑ کر گردن اڑا دینی چاہیے!" اور پھر اسے یاد آنے لگا کہ انہوں نے اسے ایف آئی اے ہونے کا ثبوت بھی نہیں دکھایا تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ گھر تھا جس کے مالکان بھی ان کی تحویل میں تھے۔

چھیکو نے اسے ان کے ہاتھ بیچا تھا۔ کتنے میں؟ کتنے پیسے ملے ہوں گے اسے؟ اور کتنے لڑکے اس نے ایسے ہی گروہوں کے ہاتھ بیچے ہوں گے؟!

مشتاق! مشتاق بھی اس جیسا ہی ایک لڑکا تھا۔

مگراب وہ ان میں سے تھا۔

نہیں! مگراس کی آنکھوں میں نرمی تھی۔

مگر مشتاق کیا کرسکتا تھا؟

سب کے پاس پستول تھے۔سب نے ٹریننگ حاصل کی ہوئی تھی۔

پٹیالہ کا کتا! ایسی ہی کوئی بات کہی تھی ان میں سے کسی نے۔سب تربیت یافتہ دہشت گرد تھے اوراس کے پاس کوئی چیز بھی نہیں تھی جس سے اپنا دفاع کرسکتا۔

کوئی نکلنے کا رستہ؟ کہیں سے؟ پیچھے سے؟

پچھلی طرف ایک برآمدہ تھا اور ایک چھوٹا سا غسلخانہ۔تینوں طرف کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔وہ غسلخانے کی چھت پر چڑھ کران میں سے کسی میں چھلانگ لگا سکتا تھا۔

لیکن کتا؟ اور گارڈ؟ ان میں سے ایک آدمی ہمیشہ گارڈ ڈیوٹی پر رہتا تھا۔

اسے کوٹھی کے اندراب کچھ آزادی تھی، کسی حدتک وہ اس پراعتماد کرنے لگے تھے۔اگرآج کی رات اسے کیورم میں بند نہ کیا گیا تو وہ اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار تھا۔

"اوہ خدایا، مگر میں اب ان کا سامنا کیسے کروں؟! جبکہ میں ان کے اصل چہرے دیکھ چکا ہوں!"

خوف ایک وزن کی طرح اس کے پیٹ میں بیٹھنے لگا مگر وہ پیٹ کی تہہ میں موجود نفرت کی ایک دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

نفرت.......!

ایک کالی آگ.......!

اس کے ہاتھ پیر پرسکون ہونے لگے۔کس قدر بے رحمی سے اوپر بیٹھے لوگوں نے اس کی موت کا فیصلہ سنا دیا تھا، اور وہ ہنسے ہوں گے.......! انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کیا ہوگا.......!

بابر کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھرآئی۔ان لوگوں نے اس کی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔اسے وہ وقت یاد آیا جب انہوں نے اسے پکڑ کرگاڑی میں ڈالا تھا۔آخری چیز جواس نے دیکھی تھی، اندھیرے میں باجوہ نے چھیکو کو گردن سے دبوچ رکھا تھا۔اس اندھیرے میں باجوہ نے چھیکو کو قتل کر دیا تھا۔

چھیکو.......! ایک قتل اس کی قسمت سے جڑ گیا تھا۔اگر یہ اصلی ایف آئی اے والے ہوتے، اوراگر وہ چھوٹ جاتا تو شاید وہ چھیکو کی ہڈیاں توڑ کراسے ہسپتال پہنچادیتا، مگر قتل؟ کبھی نہیں!

اوراب وہ قتل ہو چکا تھا، اور کل صبح گیارہ بجے.......

قتل.......!

اگراسے اپنی جان بچانے کی خاطر کسی کو قتل کرنا پڑا تو.......؟

اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جن میں اب سنسنی سی پھیل رہی تھی۔

"بابراوئے!!"، کسی نے زور سے غسلخانے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"آہ!"، بابرایک جھرجھری سی لیکر رہ گیا، "کیا؟!"

"باہرآجا بھئی اندر سو تو نہیں گیا!"، مشتاق کی آواز آئی۔

"آرہا ہوں!"

مشتاق کمپیوٹر پر سولیٹائر لگائے بیٹھا تھا۔

"آجا!"، وہ شوخی سے بولا، "سارا دن تو بیزار ہوتا رہا ہے۔ایک گیم ہو جائے!"

بابر کو اس کے لہجے میں کچھ ضرورت سے زیادہ شوخی محسوس ہوئی، شاید اس لیئے کہ وہ اس کا بھید جان چکا تھا۔

"پتے یار اس دفعہ بہت مشکل آئے ہیں"، وہ بابر سے آنکھ ملائے بغیر بولا، "ریشفل کرلیں؟"

"نہیں، انہی کو دیکھتے ہیں"، بابر مشتاق کے کندھے پر بازو رکھتے ہوئے بولا۔ مشتاق کسمسایا اور بابر مسکرا دیا۔ اس کی نظر مشتاق کی گردن پر ابھری رگوں کا جائزہ لینے لگیں۔ اس کے گلے کی گھنٹی خاصی نمایاں تھی اور وہ بار بار تھوک نگل رہا تھا اور ناک کو انگلی سے چھیڑ رہا تھا۔

"مشتاق؟"، ضیاء نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے آواز دی۔

"جی سر؟"

"ذرا یہاں آنا"

مشتاق اٹھ کر چل دیا۔ بابر کی نگاہ مین دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ طارق اندر آ چکا تھا باہر اب اس کی جگہ باجوہ نے لے لی تھی۔

"فون!"، اس کے ذہن میں یکدم بجلی کوندی۔

فون کمپیوٹر کے ساتھ پڑا تھا اور اس کی لہو مائل سرخی بابر کے حواس پر چھانے لگی۔

"ابھی نہیں"، اس کے ذہن میں کوئی بولا، "بعد میں......"

اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور وہ اٹھ کر غسلخانے کی طرف بھاگا۔ اندر سے کنڈی لگا کر اس نے کموڈ فلش کیا اور دیوار کے ساتھ سر لگا کر رونے لگا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا یہاں تک کہ غسلخانے کی دیوار اس کے آنسوؤں سے گیلی ہو گئی۔

بم! اوہ خدایا! نہیں!

بم! بم!

"نہیں! کیا قصور کیا ہے میں نے؟! کیوں یہ سب؟!"، اس نے فلش ایک بار پھر کھینچتے ہوئے سوچا۔

"میرے چیتھڑے تک اڑ جائیں گے!"، وہ ایک کونے میں بیٹھتا چلا گیا اور اپنے ایک ایک عضو کو چھونے لگا۔

پہلی بار اسے اپنے جسم کی بناوٹ کی خوبصورتی کا اندازہ ہوا۔ وہ خوف سے لرزنے لگا۔ اک ہیبت سی اس پر طاری ہو گئی اور منہ سے جھاگ چھوٹ گئی۔

اس کونے میں، ادھ موا، نہ جانے کتنی دیر وہ لرزتا رہا۔ نہ اسے ماں باپ کا خیال تھا اور نہ ہی ایک طرح سے زندگی کی پرواہ۔ موت کی ہیبت اس پر طاری تھی اور اس کی دہشت سے دماغ ماؤف تھا۔

اک انجانا ان دیکھا خوف اسے اژدھے کی طرح نگلنے لگا۔ تصور میں وہ خود کو آسمان تک اٹھتے شعلوں میں محسوس کرنے لگا۔ ہر طرف آگ ہی آگ....... آگ میں اڑتے ہوئے گلے سڑے کالے سیاہ گوشت کے لوتھڑے....... اس کے لوتھڑے....... دہشت کے وسیع سمندر میں اس کی سانسیں ڈوبنے لگیں اور ایک بھیانک تاریکی میں اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ موت کی تاریکی....... موت کے وقت....... دھماکہ....... ہر طرف آگ ہی آگ....... اتنی آگ کہ بس......... آگ میں جھلستی ایک روح....... وہ ایک لمحہ....... وہ قیامت کا ایک لمحہ....... ہیبت کی شدت سے اس کی نسیں پھٹنے لگیں اور وہ ہچکیاں لیتے ہوئے گھگھیانے لگا۔

بہت دیر بعد اس کی آنکھوں کے آگے سے اندھیرہ چھٹا تو وہ اس غسلخانے میں پڑا تھا۔

اس نے رونا چاہا مگر آنسو ختم ہو چکے تھے اور ان کی جگہ اب پیاس کی تڑپ تھی۔ اس نے سوچنا چاہا مگر سوائے ایک چوپائے کی طرح آنکھیں جھپکنے کے کچھ نہ کر سکا۔ نیند! اسے نیند چاہیے تھی، مگر کیوں؟! نہیں۔

زمین پر قدم جماتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں، اور خون کی شدت سے جلد جامنی رنگ اختیار کر گئی تھی۔ وہ اب موت کے لیے بالکل تیار تھا۔

"ہاں میں تیار ہوں"، شیشے میں سے اس کا بوڑھا، شکست خوردہ عکس اس

سے کہنے لگا، "میں اب موت کے لیے تیار ہوں"۔

لڑکھڑا کر اس نے دونوں ہاتھ شیشے پر رکھ دیئے اور اپنی آنکھوں میں گھورنے لگا، ان میں اسے بلا کی مقناطیسیت محسوس ہوئی۔ جیسے ان میں صدیوں کے دکھوں کی کہانی لکھی ہو۔

"اب میں نے زندگی کے لیے تڑپنا چھوڑ دیا ہے، بے فائدہ ہے یہ کوشش..."

بابر خاموشی سے آئینے میں اپنے ہمشکل کی باتیں سننے لگا۔

"موت نجات ہے۔ ایک طاقت ہے اور اس کے آگے میں نے اپنا سر جھکا دیا ہے......"

"ہماری کیا حقیقت ہے؟ موت اٹل ہے!"

"موت کے اس پار خواب سچائی میں بدل جائیں گے"

"بس اے دل اب اور مت دھڑک! تیری اک اک دھڑکن موت کی ساکن کائنات کے خلاف بغاوت ہے!"

"بغاوت چھوڑ دے اور آ موت سے مل جا"

"آ جا! موت میں سکون ہی سکون ہے!"

بابر کی نظریں جھک گئیں اور ٹرانس ٹوٹ گیا۔

"تو کون ہے میرے اندر؟"، اس نے پوچھا، "یہ میں نہیں ہوں"

اس نے پیشاب کیا، منہ دھویا، گن کر اس نے دس بار سانس لی اور کنڈی کھول کر باہر نکل گیا۔

"اوئے تو رو رہا تھا!"، مشتاق اس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر بول اٹھا۔

بابر نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"بیوقوف!"، مشتاق دانت پیستے ہوئے غرایا، "اپنی بھی کھال کھنچوائے گا اور میری بھی! گھر والوں کو یہ تو نہیں بتایا کہ تو کہاں ہے؟!"

"نہیں"، بابر کرسی پر گرتے ہوئے بولا۔

"شکر ہے کچھ تو عقل ہے۔ غلطی میری تھی، مجھے فون کروانا ہی نہیں چاہیئے تھا"۔

بابر خاموش رہا۔

"چل اب شکل ٹھیک کرا اپنی، گھنٹہ لگا دیا تو نے غسلخانے میں۔ ضیاء صاحب کب سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ اب جلدی سے نیچے جا کر ایک تھرماس چائے کا بنا لا۔ اُٹھ اب!"

بابر بے دلی سے اٹھا اور بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے سیڑھیاں اتر گیا۔

لاؤنج میں ضیاء، پاشا، طارق، دلاور اور مشتاق بیٹھے تھے۔

"آیئے آیئے!"، ضیاء بابر کو دیکھتے ہوئے مسکرایا، "بھئی ہمارے مہمان کو خانسامہ کس نے بنا دیا!"

بابر نے ٹرے میز پر لا کر رکھ دی۔ اس کی نظریں ضیاء سے ملیں اور ضیاء کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

"کیا بات ہے کچھ پریشان لگ رہے ہو"

"کچھ نہیں سر"

"گھر یاد آ رہا ہے؟"

"جی سر"

"لو"، ضیاء ہنس دیا، "یہ بھی تو تمھارا ہی گھر ہے"

یہ بات سب کو اتنی بیہودہ لگی کہ سب ہنس دیئے۔ مشتاق اٹھ کر سب کے لیے چائے ڈالنے لگا۔ بابر ایک طرف کو ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ بھئی بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو؟"، ضیاء بولا، "اب تم مجرم نہیں رہے بلکہ تمھیں ایک اچھی خبر سنانے کے لیے یہاں بلایا گیا ہے"۔

بابر نظریں جھکائے بیٹھ گیا۔

ضیاء نے چائے کی ایک چسکی لی، "آہ! بہت اچھی بنائی ہے"

سب خاموش ہو گئے۔

"ہاں"، ضیاء گھونٹ بھرتے ہوئے بولا، "تو میں کہہ رہا تھا کہ اب تم مجرم نہیں رہے۔ کیا خیال ہے تمھارا اس بارے میں؟"

"سر جی۔ کیا میں گھر جا سکتا ہوں؟"، نہ چاہتے ہوئے بھی بابر بول اٹھا۔

"بالکل جا سکتے ہو، کیوں نہیں جا سکتے، کہو تو ابھی چھوڑ آؤں۔ مشتاق!"

"جی سر!"، مشتاق نے کہا۔

"صاحب کا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھ آؤ!"

"سر صاحب کا کوئی سامان نہیں ہے"، مشتاق ہنسا۔

بابر نے خاموشی سے سر جھکا لیا، اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

"تم گھر جا سکتے ہو"، ضیاء نے قدرے سنجیدگی سے کہا، "مگر ابھی نہیں۔ تم نے ہمارے ساتھ کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ بولو ہمارے لئے کام کرو گے؟"

"کیسا کام؟"، بابر نے سر اٹھایا۔

"گڈ۔ ایک پیکیج لے کر تمھیں سیالکوٹ جانا ہے، کل! اس پیکیج میں کچھ ضروری کاغذات ہیں اور کچھ دوسری اشیاء جو سیالکوٹ میں ہمارے لوگوں کو چاہئیں۔ یہ تمھارا ٹیسٹ رن ہے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ ہم تمھاری ذمہ داری بڑھاتے جائیں گے اور پھر ضروری کاغذی کارروائی کے بعد تمھاری نوکری پکّی، بولو منظور ہے؟"

بابر نے بجھی ہوئی نظریں اٹھائیں اور ان چاروں کے چہروں پر دوڑائیں۔
مسکراتی ہوئی سفاک آنکھیں.......

اس بھیانک مذاق سے وہ پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب اس کی نظریں مشتاق سے ملیں تو مشتاق نے نظریں جھکا لیں۔ صرف اس کی آنکھوں میں سچائی تھی مگر اس سچ پر عمل نہ کر کے وہ بھی پوری طرح ان میں شامل تھا۔

"ٹھیک ہے سر"، بابر منمنایا۔

"شاباش! کل میری تمھارے والد سے ملاقات ہوئی تھی"

بابر نے تڑپ کر ضیاء کی طرف دیکھا۔ وہ بھرپور انداز میں مسکرا رہا تھا۔

جھوٹ! سراسر جھوٹ!

"خاصے نائس آدمی ہیں، بہت پریشان ہو رہے تھے تمھارے لئے۔ میں نے انہیں دلاسا دیا کہ بھئی آپ گھبرائیں نہیں آپ کا بیٹا بہت جلد گھر آ جائے گا۔ تم سے ملنا چاہ رہے تھے مگر میں نے انہیں سمجھا دیا کہ تم ایک دو روز تک گھر آ جاؤ گے"، ضیاء نے اپنی بتیسی کی نمائش کی۔ اس کی مونچھیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے ناک کے نیچے دو چھریاں رکھی ہوں، "پھر سب راضی باضی!"، وہ ہنس دیا۔

بابر کا خون کھولنے لگا مگر اس کے سامنے میز پر پاشا کا پستول پڑا تھا جو پاشا نے بیٹھتے ہوئے نکال کر میز پر رکھ دیا تھا، تا کہ وہ آرام سے بیٹھ سکے۔

چھیکو.......! موت.......! بم.......! آگ.......! ہلاکت.......!

"تمھاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"

بابر نے دیکھا ایک کپ چائے مشتاق نے اس کے لیے بھی ڈال دی تھی۔

بابر نے اسے ہاتھ تک نہ لگایا۔

"تو ٹھیک ہے پھر اپنی کل کی اسائنمنٹ پوری کرو اور اس کے بعد ہنسی خوشی گھر جاؤ۔ سیالکوٹ سے ہمارے آدمی تمھیں بس میں بٹھا دیں گے۔ پہلے تم یہاں آ کر رپورٹ کرو گے اس کے بعد گھر جاؤ گے۔ کسی بھی وجہ سے اگر تم یہاں نہ آ سکے یا تمھارا مشن ادھورا رہ گیا تو....... لیکن میرا خیال ہے ایسا ہو گا نہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

سب کی نگاہیں بابر پر تھیں۔ پھندا اس کے گلے میں تھا اور اب پیروں کے نیچے سے تختہ گرانے کا وقت تھا۔

بابر کی افسردہ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

"ٹھیک ہے سر، "اس نے مردہ لہجے میں جواب دیا۔

سب نے روکی ہوئی سانسیں اکٹھی چھوڑیں اور ہر چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی سوائے مشتاق کے، اس کے چہرے پر درد کی ایک کیفیت تھی۔

"چلو جی یہ مسئلہ تو حل ہوا" ضیاء سگریٹ سلگاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا، "اے ٹیم ممبران آپ لوگ تیار ہیں؟"

"یس سر!!،" سب بیک وقت بول اٹھے۔

بابر کی زندگی کے حسین ترین لمحات اس کی آنکھوں کے سامنے خود کو دہرانے لگے......

اس کے کانوں میں زاہد بھائی کی مہندی کے گانے گونجنے لگے جب وہ سب کراچی گئے تھے اور اس نے پہلی بار سمندر دیکھا تھا۔ سمندر کی پارے کی طرح چمکتی لہریں اس کے ذہن پر آج بھی نقش تھیں......

غالب مارکیٹ کی گراؤنڈ میں جو آخری چھکّا اس نے لگایا تھا۔ گیند جب پچ پر ٹھپا کھا کر اٹھی تھی وہ جان گیا تھا کہ یہ چھکّا ہوگا، اور جب اس کا بلا گھوما گیند ایک بھرپور آواز کے ساتھ بلے سے ٹکرائی تھی اور پھر اس کی نظروں کے سامنے اڑتی ہوئی باؤنڈری پار چلی گئی تھی۔ نعروں سے سٹیڈیم پھٹ پڑا تھا اور اس کی ٹیم نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا تھا......

پہلی بار جب رات کو وہ چوری چھپے گھر سے نکلا تھا، وہ سب اکٹھے نہر پر گئے تھے اور وہاں جو شرطیں لگی تھیں، انہیں سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی......

جب پہلی بار اس نے موٹر سائیکل چلایا تھا۔ وہ صرف ایک بات جانتا تھا کہ کلچ آرام سے آہستہ آہستہ چھوڑنا ہے اور جب موٹر سائیکل چلی اور جب اس نے اپنے پیر اٹھا کر پیڈل پر رکھے تھے، کتنا عجیب سا احساس تھا؟! کہ اس کے پیڈل سائیکل کی طرح چلانے بھی نہیں پڑتے تھے اور یہ چلی جا رہی تھی ....! اور جب ریس پر اس

کی کلائی گھومی تھی اس نے ریس ہینڈل کے اندر گھومتی گراریوں کو واضح طور پر محسوس کیا تھا......

اس کی جب ساجد اکرم سے لڑائی ہوئی تھی۔ اپنا وہ غصہ، وہ جوش وولولہ اسے آج بھی یاد تھا۔ کیسے انہوں نے چھٹی کے بعد سکول گراؤنڈ میں لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چھٹی کے بعد سب لڑکے وہاں جمع ہوئے تھے اور جب ساجد اس کے سامنے آیا تھا اسے آج بھی اس کی چھاتی کی مچھلیوں کا تڑپنا یاد تھا۔ جب بابر نے اپنی کمزوریوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وحشیوں کی طرح اس پر حملہ کیا تھا......

جب پہلی بار ابو نے اس کی چوری پکڑی تھی، عینک کے پیچھے ان کی آنکھیں غصے سے کیسے چمکی تھیں، وہ اسے آج بھی یاد تھا۔ اس نے ان کی دراز میں سے وہ جامنی رنگ کا دو روپے کا نوٹ اٹھایا تھا۔ ان دنوں سنو بروز نئی نئی مارکیٹ میں آئی تھی اور سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اس کے حواس پر وہی ویڈیو گیم سوار رہتی تھی......

امی کی سہیلی شازیہ کی بیٹی نائلہ۔ اس کی زندگی کی پہلی لڑکی جسے اس نے چھوا تھا۔ اسے بال بڑھانے کا بہت شوق تھا اور وہ سر میں پتہ نہیں کون کون سے تیل ملتی تھی اور اس کے پاس دنیا کے خوبصورت ترین پراندے تھے۔ اس کے بال بھی دنیا کے خوبصورت ترین بال تھے......

وہ اور شاکر جب صبح نانا ابو کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ کر واپس آتے تھے، نانی اماں انہیں نمک والے پراٹھے بنا کر کھلاتی تھیں جن کے تھوڑے سے جلے ہوئے حصوں کو وہ بہت شوق سے کھاتا تھا......

جب پانچویں جماعت میں استانی جی نے ان سے کہا تھا کہ وہ اب پنسل کی بجائے پین سے لکھیں گے۔ اس نے پہلا پین جو خریدا تھا وہ ایگل کا تھا، جس کے بیچ کے شفاف حصے میں سیاہی بھری نظر آتی تھی اور جو ذرا سا جھٹکا لگنے پر سیاہی پھینکتا تھا۔

یہ سب باتیں اور ہزاروں اور یادیں ماضی کے پنچھیوں پر بیٹھ کر آتیں اور اپنی آوازوں، اپنی خوشبو اور احساسات سے اسے خوابوں کے بادلوں میں، خوشیوں کی

ہواؤں میں اڑاتی ہوئی لے جاتیں، یہاں تک کہ اس نے دور کہیں کسی ساحل پر سمندر کی لہروں کا شور سنا اور سمندری پرندوں کی چیخ وپکار جب وہ مچھلیوں کا شکار کرتے۔

لان میں کیڑے مکوڑے اپنے جداگانہ راگ الاپنے لگے۔ لاؤنج کی چھت سے لٹکا ہوا چھوٹا سا جھومر کمرے میں روشنی کر رہا تھا اور بابر ایک صوفے پر سر کے نیچے کشن رکھے لیٹا تھا۔ سامنے دیوار پر لگی گھڑی ہر ساٹھ سیکنڈ کے بعد ایک منٹ گزار رہی تھی اور وقت پلک جھپکتے گزرتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی رگوں میں سستی محسوس کر رہا تھا، پر نہ تو اسے نیند آ رہی تھی اور نہ ہی وہ اٹھ پا رہا تھا۔ وقت اس کی انگلیوں میں سے ریت کی مانند پھسلتا جا رہا تھا۔

اس وقت اسے چیتے کی طرح ہوشیار ہونا چاہیئے، اس نے بے دلی سے سوچا۔ مگر کیا فائدہ؟ چیتے کی طرح ہی وہ اسے مار دیتے، فوراً، بے دریغ!

طارق نے ضیاء کو اس کا دروازہ دھماکے سے کھولنا بتا دیا تھا اور فوراً ہی ضیاء کی آنکھوں میں شبہات چھا گئے تھے۔ کسی نے اسے کچھ نہ کہا تھا اور نہ ہی کوئی پوچھ گچھ ہوئی تھی مگر وہ سب چوکنے سے ہو گئے تھے۔ مشتاق نے اسے اپنے کمرے سے مذاق میں نکال دیا تھا اور ہر لحہ ان میں سے کسی نہ کسی کی آنکھ اس پر رہتی تھی، جیسے وہ اس کی اگلی حرکت کا انتظار کر رہے ہوں۔

ہر طرف اندھیرہ پھیل گیا۔ ساڑھے سات بجے کا وقت تھا۔ اس کے پاس زندہ رہنے کے لیے تقریباً پندرہ گھنٹے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ کتنے پرسکون طریقے سے وقت کا شمار کر رہا تھا۔ اس کی تمام تر امیدیں مشتاق کے کمرے میں پڑے فون پر بندھی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ اب مشتاق مر کر بھی فون نہیں کرنے دے گا۔ مشتاق، جسے اس کی حالت پر افسوس تھا، جو اسے پسند کرتا تھا، اسی نے وہ آخری راستہ اس پر بند کر دیا تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ بوریت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور حد سے زیادہ دکھ بھی کچھ دیر کے بعد انسان کو بور کر دیتا ہے۔ بابر نے اٹھ کر ٹی وی لگا لیا۔

اس دوران اے ٹیم پلان "اے" پر عمل کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ دلاور بازار سے ایک کالے چمڑے کا بیگ لے آیا جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا تالا بھی تھا۔ اوپر والی منزل پر کانفرنس روم کے ساتھ ایک کھلا کمرہ تھا جسے ان لوگوں نے سٹور روم بنایا ہوا تھا۔ اس کمرے میں مکان کا اصلی مالک ملک داؤد اور اس کا خاندان قید تھا۔ سارا دن، ساری رات ملک داؤد، اس کی بیوی اور اس کی دو کم سن بچیاں اس کمرے میں بند پڑے رہتے۔ اسی کمرہ میں لوہے کی ایک الماری تھی جس میں مقناطیسی چارج، ٹائم ڈیلے فیوز، سوئچ، بم کیموفلاج کیسنگ، ٹی این ٹی اور ضرورت کی دوسری اشیاء پڑی تھیں۔

پاشا نے نائٹروگلائسرین کیوب نکال کر ان کے ساتھ ڈیجیٹل ٹائم سوئچ منسلک کیا اور اسے ہارڈ کیموفلاج کیسنگ میں پیک کر دیا۔ کیسنگ کے ساتھ اس نے شارٹ سرکٹ فیوز لگا دیا جس کے بعد بم سے زبردستی نہیں کی جا سکتی تھی۔ کیسنگ کو اس نے ایک ڈبے میں ڈالا جس کے اندر فوم کی لائننگ تھی اور بم کسی قیمتی شئے کی طرح اس میں فٹ ہو گیا۔ ڈبے کو اس نے کالے چمڑے کے بیگ میں ڈال دیا اور دلاور نے بیگ کو ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں رکھ دیا۔ دھماکے کا وقت ڈاکٹر صاحب نے سیٹ کرنا تھا۔

بم سے فارغ ہو کر وہ اپنا باقی سامان سمیٹنے لگے۔ اگر مشن اے پلان کے مطابق چلتا، جس کی انہیں پوری امید تھی، تو ایک ہفتے کے اندر انہیں یہ جگہ چھوڑنی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد ان میں سے ہر ایک کے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم پہنچ جاتی جس سے وہ کہیں بھی آرام سے ایک نئی زندگی شروع کر سکتے تھے۔

کھانے میں انہوں نے بابر کو اپنے ساتھ شریک کیا۔ بابر کو بھوک بالکل نہ تھی مگر پھر بھی انہوں نے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ مشتاق بازار سے چکن بوٹی اور نان لے کر آیا تھا اور ساتھ میں سلاد اور رائتہ بھی تھا۔

" کچھ بوٹیاں جیک کے لئے چھوڑ دینا"، باجوہ دانتوں میں پھنسے گوشت

کے ریشے ایک طرف تھوکتے ہوئے بولا۔

"تو چھوڑے گا تو جیک کو کچھ ڈالیں گے"، پاشا نے کہا اور سب ہنس دیئے۔

"جیک کی بھی خوراک اب بہت ہو گئی ہے"، مشتاق نے پیاز رائتے میں ڈبوتے ہوئے کہا۔

"ویسے باجوہ نے جس طرح ملک داؤد کے کتے کو پالا ہے۔ کیا بات ہے!"، دلاور نے باجوہ کو مکھن لگایا۔

" بیٹا تو اگر اس دن اسے گولی مار دیتا ناں تو شاید ہم اب بیٹھے تیری بوٹیاں کھا رہے ہوتے"، طارق دلاور سے مخاطب ہوا، اور سب ہنس پڑے۔

"مشتاق"، باجوہ نے پیپسی کا ایک گھونٹ بھرا، " کل جیک کو اوجری ڈالنی ہے، ابال کر"

"مجھ سے نہیں ڈلتی اوجری شوجری!"، مشتاق تنک گیا۔ باجوہ نے اسے گھورا۔

"یار"، دلاور نے نان توڑتے ہوئے کہا، " کچھ تو خیال کرو، ابھی ہم کھانا کھا رہے ہیں!"

"ہاں"، مشتاق ہنسا، "اور کل کے بعد جیک کو کھانا ڈالنے کا ٹائم کسے ملنا ہے"۔

"میں تیری گردن توڑ دوں گا!"، باجوہ گرجا۔

" تمیز سے!"، پاشا نے ان دونوں کو جھاڑا، " کھانے کی میز پر کتوں کی طرح لڑ رہے ہو! آرام سے کھانا کھاؤ!"

"بابر بہت چپ چپ ہے، کیا بات ہے بھئی"، طارق بابر کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

"پاشا اس کا ذہن پڑھ کر بتا یہ کیا سوچ رہا ہے"، دلاور بولا۔

"پاشا کی بھی کیا بات ہے"، مشتاق نے کہا، " آدمی کی شکل دیکھ کر اس کی

قسمت بتا دیتا ہے!"

پاشا نے اسے گھورا۔ "یہ ہنسی مذاق کی بات نہیں ہے"۔

مشتاق جھینپ گیا۔

"کیوں بابر کیا سوچ رہے ہو؟"، دلاور نے سوال کیا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ جیک کو یہیں کھانے کی میز پر لے آنا چاہیے، ہمارے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر کھاتا"

باجوہ کھل کر ہنس دیا۔ "ہاں!"، اس نے اپنی ران پر ہاتھ مارا، "اور پھر مشتاق کو پٹہ ڈال کر باہر گھمانے لے جاتا!"

مشتاق نے نظریں جھکا لیں، اس کے ہونٹ کپکپائے۔ پاشا نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ اپنی عزت اپنے ہی ہاتھ میں ہوتی ہے۔

دس بج گئے۔

مشتاق اور بابر نے برتن سمیٹے اور پلیٹیں اٹھا کر نیچے کچن میں لے گئے۔ دونوں مل کر برتن دھونے لگے۔

پاشا نیچے اتر آیا۔ مشتاق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

پاشا نے سگریٹ سلگایا۔

"بابر سگریٹ پیتے ہو؟"، ناک سے دھواں چھوڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"نہیں سر"

"یہ لو سگریٹ"، پاشا نے ڈبی بابر کی طرف بڑھائی، "ایک سگریٹ سلگاؤ اور میرے ساتھ بیٹھ کر پیو۔ دھواں بیشک منہ سے ہی باہر نکال دینا"۔

بابر نے مشتاق کی طرف دیکھا، اور پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر پاشا کی ڈبی میں سے ایک سگریٹ نکال لی۔ پاشا واپس چل دیا۔ بابر بھی اسے کے پیچھے ہولیا۔

پاشا کیو روم کے سامنے ہال میں دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے بابر کو اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بابر ایک گدی چھوڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ مشتاق

سیڑھیاں چڑھ گیا۔

پاشا نے ہاتھ بڑھا کر لائٹر جلایا اور بابر نے آگے جھکتے ہوئے سگریٹ سلگائی۔ منہ میں دھواں بھر کر اس نے باہر پھونک دیا۔

پاشا نے گردن صوفے کی پشت سے ٹکا لی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ سلگتا ہوا سگریٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کچن کے کھلے دروازے سے روشنی پھیل رہی تھی مگر وہ نیم تاریکی میں بیٹھے تھے۔

پاشا نے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ تاریکی میں خوف ننھے ننھے چوہوں کی مانند کونوں کھدروں میں سے نکل آیا۔ بابر کو احساس ہوا کہ آج کا دن گزر چکا تھا۔ آج کا دن کبھی بھی اب واپس نہ آ سکتا تھا۔ اگر آج کا دن اس کی زندگی کا آخری دن تھا تو اس کو گزارنے کا یہ کونسا طریقہ تھا؟ اب وقت کیا ہو رہا تھا؟

"جادو پہ یقین رکھتے ہو؟"

"کیا؟!"

پاشا نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"نہیں"، بابر نے سگریٹ سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"کبھی دیکھا جو نہیں"، بابر نے پاشا کو بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

پاشا نے سگریٹ کا ایک بھرپور کش لیا۔

"قسمت پر یقین رکھتے ہو؟"

بابر نے سگریٹ کی راکھ زمین پر جھٹک دی۔

"ہاں"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں نے یہاں پہنچنا نہیں چاہا تھا"

پاشا نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"آپ جادو جانتے ہیں؟"، بابر نے سوال کیا۔

پاشا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں، مگر میں کچھ علم رکھتا ہوں"

بابر نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آپ میرے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟"، بابر نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

پاشا نے کش لگاتے ہوئے تائید میں گردن ہلا دی۔

بابر تذبذب کے عالم میں سگریٹ ایک ہاتھ سے دوسرے میں بدلنے لگا۔

"میں حیران ہوں تم پر"

"وہ کیوں؟"

پاشا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر اس کی نظر بابر کی پیشانی کی طرف اٹھ گئی۔

"کیونکہ ہم جو سوچ رہے ہیں وہ تم پر لاگو نہیں ہوتا"

"آپ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟"، بابر اپنے لہجے کی کاٹ کو چھپا نہ سکا۔

"تم یہاں کیوں ہو؟"، پاشا نے الٹا اس سے سوال کیا۔ بابر خاموش رہا۔

"تم کیا بتاؤ گے"، پاشا نے کش لگاتے ہوئے کہا، "تم خود نہیں جانتے۔ سوچتا ہوں کہیں ہمارا وقت تو نہیں بدلنے والا؟ وقت بدلنے لگا ہے، تمھارا وقت بدلنے لگا ہے مگر تمھارے ستاروں کا رخ قوس کی جانب کیوں ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ اس میں ہمارے لیئے کیا نشانی ہے؟ کیا یہ ایک اچھے وقت کی نوید ہے؟ مگر اس قدر زبردست ہیجان کے بارے میں کوئی کیا کرسکتا ہے۔ سنیاسی بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہر چیز چھپ گئی ہے۔ سب پردے میں ہے۔ ان پردوں کے پیچھے کیا ہے؟"، وہ بیٹھے بیٹھے کسمسایا۔

اس کے بعد کوئی بات نہ ہوئی۔ پاشا نے خاموشی سے اپنا سگریٹ ختم کیا اور زمین پر پھینکتے ہوئے اسے مسل دیا۔

"آؤ"، وہ بولا، اور بابر کا بازو تھامے اسے کیو روم میں لے گیا۔

"اوپر ابھی جگہ نہیں ہے۔ آج آخری رات یہاں رہو"، یہ کہتے ہوئے پاشا نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

بابر تاریکی میں منہ کھولے بند دروازے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کیو روم میں گھپ اندھیرا تھا۔

اس رات اگر وقفے وقفے سے کہیں مشین چلنے کی آواز نہ آتی تو شاید بابر پاگل ہو جاتا۔ اس علاقے میں بنی کوٹھیاں ابھی نئی تھیں اور رات میں کیوروم کی بائیں جانب کی دیوار میں سے کہیں مشین چلنے کی آواز آنے لگی۔

اس نے چاہا کہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخیں لگائے، شاید کوئی اس کی آواز سن لے، مگر پھر اسے احساس ہوا کہ سب سے پہلے آواز انہی لوگوں نے سنی ہے۔

گھپ اندھیرے میں وقت، سمتیں، فاصلے، سوچیں، اندازے سب آپس میں بری طرح الجھ گئے۔ اس تاریکی میں اس کی حالت ایک بچھڑے ہوئے جانور کی سی تھی۔

کئی بار وہ دیواروں سے ٹکرایا اور ہر بار طیش میں آکر اس نے ان دیواروں پر نہتے ہاتھ پیر سے حملہ کیا۔ دل و دماغ کی اندھی تاریکی میں صرف اعضاء کا درد ہی ایک ایسا احساس تھا جسے پوری طرح ناپا تولا جا سکتا تھا۔ درد ہی کا سہارا لے کر عقل کو پاگل پن کے دہانے میں جانے سے بچایا جا سکتا تھا۔

اس کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ وہ حلق سے جانوروں کی سی آوازیں نکالنے لگا، اپنی انگلیاں چبانے لگا، اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے لگا۔ اور پھر درد اتنا بڑھ گیا کہ اس کے سرور کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اور اپنے اعضاء کو سہلانے لگا، اور بری طرح ہانپنے لگا، اور پسینے میں شرابور ہونے لگا۔

جسے سزائے موت سنائی جاتی ہے وہ آخری لمحات میں بیٹھ کر اپنے جرم کا

حساب کتاب کرتا ہے، جس نے جرم ہی نہ کیا ہو وہ کیا کرے؟ کسے الزام دے؟ اپنے کس عمل کو اس سزا کا مستحق ٹھہرائے؟ اس کے لیے کونسا رستہ کھلا ہے، جنت کا یا جہنم کا؟ وہ کس سے معافی مانگے؟ اپنے پیدا کرنے والے سے یا اپنے پالنے والوں سے؟ وہ کس چیز کی معافی مانگے؟ وہ کس کس چیز کی معافی مانگے؟ کون اس کی آواز سنے گا؟ کیا اسے معاف کر دیا جائے گا؟ اگر نہیں کیا جائے گا تو کیوں نہیں کیا جائے گا؟ کیا حق ہے کسی کو اسے معاف نہ کرنے کا؟ کیا حق ہے کسی کو اسے قصوروار ٹھہرانے کا جب اس کے اپنے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے؟ کیا وہ بدلے کا حقدار نہیں ہے؟ کیا معاف کرنے کا حق اسے نہیں ہے؟ کیا اسے جزا یا سزا کا فیصلہ سنانے کا حق نہیں ہے؟ وہ کیا کرے؟ کس پر انحصار کرے؟ اس اندھی بربادی، اس کالی کالک تنہائی میں وہ کسے آواز دے؟ وہ کیسے امید کرے؟ وہ کیا کر سکتا ہے؟ وہ کیا کرے؟ وہ کیا کرے؟ وہ.......

"آنکھیں!"

"ہاں آنکھیں!"

"یہ سب آنکھوں کا قصور ہے!"

"ہاں ان آنکھوں کی وجہ سے میں پاگل ہوا جا رہا ہوں"

"آنکھوں کو کچھ دکھائی نہیں دیتا ورنہ باقی سب تو ویسے ہی ہے"

"ان آنکھوں کو پھوڑ دوں!"

"پھوڑوں کیوں؟ صرف بند کر لوں!"

"کون ہے؟"

"کیا کوئی ہے؟"

"اس کمرے میں کون ہے بھئی؟!"

"میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے"

"یہ کیا تھا!! یہ کیسی آواز تھی؟!"
"کچھ بھی نہیں میں اٹھ کر بیٹھا ہوں"

"اوہ!"
"پھر اب؟"
"پھر کیا؟"
"پھر کچھ بھی نہیں"
"پھر اب وقت کیا ہے؟"
"پھر پتہ نہیں"
"پھر چپ ہو جاؤ!"

"کلمے کتنے یاد ہیں؟"
"بکواس نہیں! میں مرنے نہیں لگا!"
"ٹھیک ہے یار بندہ بات تو آرام سے کرتا ہے"
"تیری زبان کھینچ لوں گا اگر اب بھونکا تو!"
"استاد جی! استاد جی! یہ کہتا ہے یہ میرے زبان کھینچ لے گا!"
"ہیں؟! کیوں اوئے؟ تو نے کیا کہا ہے اسے؟"
"کچھ نہیں استاد جی"
"کچھ نہیں کے بچے میں نے سب سن لیا ہے! چل اٹھ، دیوار کی طرف منہ کر کے سو بیٹھکیں نکال!"

"اوہ مر گیا یار!"
"اف!"

"یہ میں بیٹھکیں کیوں نکال رہا ہوں؟!"
"ہیں؟ کیا؟!"
"کتنی نکال لی ہیں؟"
"کب سے نکال رہا ہوں؟!"

"سو کیوں رہا ہوں؟!"
"یہ تو بے غیرتی کی انتہا ہے!"
"عقل سے کام لینا چاہیے"
"دروازہ کہاں ہے؟"
"یہ...... یہ مل گیا"
"اسے کھولنے کی کوشش....."

"یہ تو نہیں کھل رہا!"
"ہمت نہیں ہارنا! ہمت نہیں ہارنا!"
"مشتاق! مشتاق ضرور میرے لئے کچھ کرے گا! وہ مجھے مرنے نہیں دے گا!"
"ہوسکتا ہے مشتاق نے تھانے فون کر کے انہیں سب کچھ بتا دیا ہو!"
"مگر اس طرح تو وہ خود بھی پکڑا جائے گا!"
"نہیں پاگل! سرکاری گواہ بن جائے گا!"
"اوہ! پھر تو پولیس آتی ہی ہوگی"

"پولیس نہیں آئی"
"ابھی دیر ہی کتنی ہوئی ہے"

"کتنی گرمی ہے!"

"قمیص اتارلوں"

"عامر"

"عامر کو سکول چھوڑنے جانا ہے"

"اوہ یار، آج پھر میرے پاس پیسے نہیں ہیں اسے ناشتے میں حلوہ پوری کھلانی ہے"

"میرا بھائی! تجھ پر پورے لاہور کی پوریاں قربان ہیں جگر!"

"صبح کے لیے کوئی پلان؟ کوئی تدبیر؟"

"تدبیر کیا کرنی ہے، موقع دیکھ کر کریں گے"

"کیا ان میں سے کوئی میرے ساتھ بس میں جائے گا"

"بم کس چیز میں ہوگا؟"

"مجھے کیسے پتہ چلے گا؟"

"میرے پاس ان باتوں کا جواب نہیں ہے صبح ہوش سے کام لینا!"

"بابر!"

"بابر!"، مشتاق نے اسے جھنجھوڑا۔

"بابر اٹھ!"

ایک [illegible] سے بابر نے آنکھیں کھول دیں۔

"یہ کمرے کے بیچ فرش پر ننگے کیوں پڑے ہو؟"، مشتاق ہنسا۔

بابر [illegible] سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیا یہ سب خواب تھا؟ کیورروم کا دروازہ کھلا تھا، بتیاں جل رہی تھیں اور مشتاق اس کے سر پر کھڑا تھا۔

"چل نہا دھو لے، سفر کی تیاری نہیں کرنی؟"

بابر نے سوچا اٹھ کر ننگے ہی دوڑ لگا دینی چاہیئے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"آجا"، مشتاق نے کہا اور چل دیا۔

بابر طارق کے غسلخانے میں نہایا۔ وہ نہا کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا بستر پر ایک نئی شلوار قمیص استری کر کے رکھی ہوئی تھی۔

"تیرے لئے ہے شہزادے"، کرسی پر بیٹھے دلاور نے اشارہ کیا، "تیرے کپڑوں سے اب بکروں جیسی بو آنے لگی ہے!"

بابر کی نظریں دلاور سے ملیں۔ دلاور کی آنکھوں میں قصائیوں کی سی چمک تھی۔ بستر پر پڑی شلوار قمیص کا رنگ ہلکا سبز اور بٹنوں کے ساتھ خوبصورت کڑھائی ہوئی تھی۔

"یہ کپڑے ٹھیک ہیں"، بابر اپنی والدہ کے دیئے سوٹ کو سہلاتے ہوئے بولا۔

"کیوں بھئی؟"، اس نے آگے بڑھتے ہوئے قمیص اٹھائی، "بالکل نئے کپڑے ہیں، یہ پندرہ سو روپے کا سوٹ ہے........"

"آپ نے اتنا مہنگا سوٹ کیوں خریدا!؟"

"کیوں کیا......"، دلاور ہکلایا، "یہ کپڑے پہن لو، تمھارے اس سوٹ سے بہتر ہیں"۔

"یہی سوٹ ٹھیک ہے"

دلاور نے غصے سے بابر کو گھورا۔ بابر پرسکون انداز میں اپنی قمیص کے بٹن بند کرنے لگا۔

دلاور نے آگے بڑھ کر میز پر سے پرفیوم کی ایک بوتل اٹھا کر اس کی طرف اچھال دی۔

"یہ چھڑک لو"، وہ بستر پر سے نیا سوٹ کھینچتے ہوئے بولا "اگر جانوروں کی

طرح رہنا چاہتے ہو تو کم از کم جانوروں جیسی بو نہ مارو!"

بابر نے شیشی رکھ کر کنگھی اٹھا لی اور آئینہ دیکھتے ہوئے بال سنوارنے لگا۔

اس کے گالوں پر ہلکی سی سرخی پھیلی ہوئی تھی اور جبڑے پر ہلکی ہلکی شیو ابھر آئی تھی۔ قلمیں کچھ بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اسے بال کٹوانے کی ضرورت تھی۔

کنگھی کر کے بابر واپس گھوما۔ دلاور ابھی بھی وہیں کھڑا تھا۔ بابر نے مسکراتے ہوئے پرفیوم کی شیشی اٹھائی اور اپنی کلائیوں پر چھڑکنے لگا۔

جب وہ لاؤنج میں آئے تو ناشتہ تیار تھا۔ مشتاق نے آملیٹ تیار کیا تھا اور میز پر شہد بھی پڑا تھا۔ سب کی نظریں بابر پر تھیں۔ وہ بہت ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔

بابر نے دیکھا لاؤنج کی گھڑی ساڑھے نو بجا رہی تھی۔

"جی جناب..... او ہو آپ نے نیا سوٹ نہیں پہنا؟" ضیاء نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

بابر مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا یقین، ایسا اطمینان تھا کہ ضیاء کی زبان پھسلنے لگی۔

"چلو خیر ٹھیک ہے، یہ بھی بہت اچھا ہے، ڈاکٹر..... اوہ..... مشتاق..... کیا کہہ رہا تھا میں؟"

"ناشتہ تیار ہے"، مشتاق نے خاموشی سے کہا۔

"ہاں، چلو بھئی، سب ناشتہ کریں۔ بیٹھو بابر!"

"جب تم سیالکوٹ پہنچو گے .... طارق مکھن پکڑانا"، ضیاء نے چھری اٹھاتے ہوئے کہا، "وہاں اڈے سے لوکل یونٹ کے لوگ تمھیں اپنے ساتھ لے لیں گے۔ وہ تمھیں اپنے شناختی کارڈ دکھائیں گے۔ تم ان کے ساتھ چلے جانا۔ ڈویژنل آفس میں پہنچ کر......"

بابر خاموشی سے ڈبل روٹی پر شہد لگا کر کھانے لگا۔ وہ سب تیار تھے، اس نے دیکھا۔

"ان میں سے کون میرے ساتھ جائے گا؟"، وہ ڈبل روٹی چباتے ہوئے سوچنے لگا۔

"اڈے تک تو سبھی جائیں گے...."

"طارق کی شیو تازہ لگ رہی ہے..... یا پھر باجوہ......"

اس نے ہاتھ میز سے گراتے ہوئے چھری شلوار کے نیفے میں اڑس لی۔

باجوہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس جانور کی مانند تھیں جو گھات لگا کر شکار کا انتظار کرتا ہے، اور یہ جان کر بابر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، کیونکہ باجوہ اس کی بو سونگھ رہا تھا!

اس کی آنکھوں کے سامنے بابر نے چھری نیچے کی تھی مگر باجوہ نے دیکھا تک نہ تھا۔ باجوہ کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور وہ بابر کے کپڑوں سے اٹھتی بو محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب ہیجان کی سی کیفیت تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر؟"، ضیاء نے سوال کیا۔

"ٹھیک ہے سر"، بابر نے میکانیکی انداز میں جواب دیا۔ اس نے سنا تک نہ تھا کہ ضیاء کیا کہہ رہا تھا۔

"گڈ"، ضیاء نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا، "یہ کام ہو جانے کے بعد ہم تمھیں آٹھ دس دن کی چھٹی دیں گے۔ تم آرام سے گھر چلے جانا"

"سر پھر واپس کب آؤں گا؟"، بابر نے ضیاء کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"واپس؟"، ضیاء چونکا اور پھر وہ مسکرا دیا، "جب جی چاہے۔ ہاہاہا!! چلو اب ناشتہ ختم کرو، بس نکلنے کا وقت ہو رہا ہے!"

ناشتہ کر کے وہ پورچ میں نکل آئے۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور دھوپ میں کھڑی آلٹو کا سفید رنگ نکھر آیا تھا۔

بابر کی نگاہ اٹھی۔ سامنے والے گھر کی کھڑکی پر سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔

چہرہ اس کھڑکی کے پیچھے تھا تو وہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ شہد لگی چھری اس کے نیفے میں تھی۔ اُس پر ہاتھ رکھے وہ لان میں آ گیا۔ جیک اسے دیکھ کر دو تین مرتبہ بھونکا۔

باجوہ نے کوٹھی کا گیٹ کھولا۔ ضیاء باہر نہیں نکلا۔ دلاور نے گاڑی سٹارٹ کی اور اسے ریورس کرنے لگا۔

آ جا بھئی"، طارق جیب میں کچھ پیسے ڈالتے ہوئے بابر سے مخاطب ہوا۔

پاشا باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کالے چمڑے کا ایک سکول بیگ تھا۔ بابر کی نظریں اس بیگ پر گڑ گئیں۔ پاشا کے پیچھے مشتاق بھی باہر نکل آیا۔

پاشا نے بیگ کو سٹریپ سے پکڑ رکھا تھا۔ زپ کو ایک چھوٹا سا تالہ لگا تھا اور لگ رہا تھا جیسے بیگ میں جوتوں کا ڈبہ بند ہو۔

"جا رہا ہے پھر،" مشتاق اس کے پاس آ کر بولا۔

بابر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ مشتاق کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں اور اُن میں ایک اداسی سی چھائی تھی۔

"اپنے گھر کا فون نمبر دے دے،" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیوں؟"

"میں انھیں بتا دوں گا کہ تو سیالکوٹ گیا ہے"

مشتاق کی نظریں بابر کے چہرے کے نشیب و فراز کو یادداشت کی انگلیوں سے چھونے لگیں۔

"بابر؟!۔" پاشا نے اسے آواز دی۔

بابر پلٹ کر گاڑی کی طرف چل دیا۔

"بابر؟،" مشتاق کی بھرائی ہوئی التجا اس کے کان میں پڑی۔

طارق نے گاڑی کا پچھلا دروازہ بابر کے لیے کھولا۔ بابر درمیان میں بیٹھ گیا۔ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر پاشا اس کے ساتھ آ بیٹھا۔ بیگ پاشا نے ٹانگوں میں رکھ لیا۔

طارق بابر کے ساتھ آ بیٹھا۔ دروازہ بند ہوا اور گاڑی چل دی۔ پورچ میں مشتاق اکیلا کھڑا رہ گیا۔

گاڑی لاہور کی سڑکوں پر چل نکلی۔

طارق نے اپنا بازو بابر کے شانے کے گرد ڈال لیا۔ بابر گاڑی کی ونڈ سکرین پر دھوپ اور درختوں کے سایوں کے بیچ ہوتی آنکھ مچولی دیکھنے لگا۔ ایک گرم دن کا سورج نیلے آسمان میں دہک رہا تھا۔

بابر کو شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگا۔ کاش وہ گاڑی میں بیٹھا ہی نہ ہوتا! وہ خود کو بندھا ہوا، جکڑا ہوا تصور کرنے لگا اور ہاتھ پیر ہلانے کی ایک شدید خواہش اس کے حواس پر چھا گئی۔ اس کالے بیگ میں بند بم! وہ اسے ایک جگنو سے تشبیہ دینے لگا۔ بیگ کی تاریکی میں بند جس کا ننھا سا آگ کا شعلہ جل بجھ رہا تھا۔ جب وہ جگنو آزاد ہوتا اور بابر سے لپٹتا چلا جاتا تو اس کی بھڑکتی آگ میں ....

نہیں! بابر نے سر جھٹکا۔ گاڑی چلاتے ہوئے دلاور نے بیک مرر میں اسے دیکھا۔ بابر نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور اسے باہر کی دنیا کی ہر حرکت میں آزادی محسوس ہوئی۔ گرمی سے بہتے پسینے کے ہر قطرے میں، سڑک پر اٹھتے ہر پیر میں، روڈ پر گھومتے ہر ٹائر میں اسے آزادی کی گردش محسوس ہوئی۔ وہ ایک شیشوں والی قبر میں بند تھا اور پاشا کے سگریٹ سے اٹھتا دھواں ....! دلاور کے تھوڑے سے کھلے شیشے میں سے اسے ہوا کا تھوڑا سا گزر محسوس ہوا۔

"پاشا صاحب شیشہ نیچے کر لیں"

پاشا نے شیشہ نیچے کر لیا۔

بابر کی نگاہیں کالے بیگ پر سے ہوتی ہوئیں باہر کے منظر کو اپنے اندر سمونے لگیں۔

ایک موڑ کاٹ کر گاڑی مین روڈ پر نکل آئی۔ تازہ ہوا کا ایک جھونکا بابر کے چہرے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔

دھوپ میں ہر شئے کا رنگ نکھر آیا تھا۔ دن کی گرمی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔

دکانوں کے سائے میں چلنے والے راہگیر بابر کو بہت بھلے لگے۔ ویگنوں کے نوٹ گنتے کنڈیکٹر، اپنی آدھی سیٹوں پر بیٹھے، چار پہیوں پر چلتی اپنی روزی کے ہچکولے کھاتے اس کے پاس سے گزرتے گئے۔ ویگنوں کے دھوئیں سے دلبرداشتہ موٹر سائیکل سوار گرمی میں اپنے سر ہیلمٹ میں پھنسائے تازہ ہوا کو ترس رہے تھے۔

ایک ریڑھی والے کا گدھا رک کر سڑک پر پاخانہ کرنے لگا۔ ریڑھی والے نے گھما کر گدھے کی پیٹھ پر چابک رسید کی۔ گدھا چیختے ہوئے، پاخانہ کرتے ہوئے، اپنی زندگی کی ریڑھی کو سڑک پر کھینچنے لگا۔ اخبار بیچنے والے بچے دھوپ میں ننگے سر موت اور دھماکوں کی خبریں بیچ رہے تھے۔ یہ سب، زندگی، زندگی جو پھولوں کی سیج نہیں تھی۔ زندگی، جو قربانیاں مانگتی تھی۔

زندگی...... جو اپنا پیٹ کاٹ کر جینے کا نام تھا۔ زندگی...... جس سے بابر ہمیشہ بھاگتا رہا۔ زندگی...... جو ذمہ داریوں کی چکی میں پسنے کا نام تھا، اور جس کی بندش سے بابر نے ہمیشہ جان چھڑوانے کی کوشش کی۔ زندگی...... جو اس کے باپ نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اسے دی۔ پوری عمر ہل میں جتے ایک بیل کی طرح اس نے محنت کی اور جب اس نے بابر کے بل کو اس سے جوتنے کی کوشش کی، بابر ایک سرکش بچھڑے کی طرح صرف اس سے بچنے کی تگ و دو میں لگا رہا۔ زندگی...... جو اس کی ماں نے اپنا جگر کاٹ کر اسے دی۔ ماں، جو اپنے بوجھ کے علاوہ اس کا بوجھ بھی ایک لمحے میں اٹھا لیتی اگر یہ ہو سکتا۔ ہر لمحے بابر کو اس کے بوجھ کا احساس دلاتے ہوئے، اسے ہر وقت کوستے ہوئے، جھاڑتے ہوئے، بولتے ہوئے اس نے اپنے الفاظ کی اہمیت کھو دی۔ بابر پھر بھی اپنا بوجھ اٹھانے سے منکر رہا۔ زندگی...... جو اس نے نہیں لی۔ انہوں نے کبھی اس سے سہانے سپنوں کے وعدے نہیں کیئے تھے۔ انہوں نے اسے وہی دیا جو وہ دے سکتے تھے۔ ان کی خود کی غلطیوں میں، کمزوریوں میں لپٹا زندگی کا نذرانہ۔ زندگی...... دکھوں سکھوں، ذمہ داریوں، تکلیفوں سے بھری زندگی،

جو اس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر انسان کے نصیب میں لکھ دی گئی ہے۔ وہ جان گیا...... وہ بھاگتے بھاگتے رک گیا...... بابر نے ہمیشہ اپنی پہنچ سے باہر عجب ناک خیالوں کو زندگی جانا۔ اس نے دوسروں کی بظاہر پرسکون زندگی کو زندگی جانا۔ اس نے حسرتوں کے پورا کرنے کو مقصد حیات سمجھا۔ اس نے اپنی محرومیوں کو زندگی جانا، کچھ حاصل کرنے کی خواہش کو زندگی جانا۔ اس نے بلندی کو، عالمگیری کو اپنی منزل بنایا، لیکن اسے منزل کی طرف لے جانے والے رستے کی یہ سب رکاوٹیں تھیں، یہ اس نے نہ جانا۔ اس نے اس رستے کو ولولے سے محروم، مصائب سے پر، بے رنگ مشقت اور بے معنی مشکلات سے بھرپور پایا۔ اس نے اس کو اپنی راہ نہ خیال کیا اور اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈتے ہوئے ہمیشہ اسی رستے کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ مگر اب وہ جان گیا کہ یہ رستہ ہی اس کی زندگی تھی۔ یہ زندگی جو روح کا عذاب بھی تھی اور پل بھر کی خوشی بھی۔ بابر نے اس زندگی کو قبول کر لیا۔

"سگریٹ؟"، پاشا نے ڈبی اسے آفر کی۔

"نہیں"، بابر نے پلکیں جھپکیں اور اس کی نگاہیں خود بخود واپس اس کالے بیگ پر مرکوز ہو گئیں۔

پاشا نے پہلا سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے ایک اور سگریٹ سلگا لی۔

"یاد ہے"، باجوہ نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا، "اس کو ہم نے اِدھر سے پکڑا تھا!"

"ہاں!"، طارق ہنسا۔

بابر نے بھی اس طرف دیکھا اور پھر وہ گلی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ گلی جہاں سے پولیس والوں نے چھیکو کی لاش اٹھائی ہو گی۔ بابر کا ہاتھ چھری پر گیا اور اس کی سختی سے اسے کچھ اطمینان کا احساس ہوا۔ خوف پھر سے اس کے دل کے گوشوں کو چھونے لگا۔

"نہیں!"، اس نے سوچا، "اب ڈرنا نہیں"

دل ہی دل میں اس نے کلمہ شہادت پڑھا۔ ماں کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی، وہ اس سے اپنی ہمت بڑھانے لگا۔

چند منٹ کے بعد وہ بادامی باغ جنرل بس سٹینڈ میں داخل ہو گئے۔ ہر طرف اک عجب بھیڑ چال تھی۔ پاشا کی بھویں سکڑ گئیں۔ بابر کو احساس ہوا کہ گاڑی میں خاموشی چھا گئی تھی۔ ان کی آنکھیں اردگرد ہونے والی ہر حرکت کا جائزہ لینے لگیں اور بابر کی نگاہیں کسی مقناطیس کی طرح کالے بیگ سے چپکی تھیں جس کا زپر دھوپ میں لشکارے مار رہا تھا۔

گاڑی نے بس سٹینڈ کا ایک مکمل چکر لگایا۔ خلقت کے اس بے پناہ رش میں کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ بالکل دریا کے کنارے پانی پیتی بھینسوں کی طرح جو پانی میں چھپے مگرمچھ سے بے خبر ہوتی ہیں۔

"بول پاشا؟"، دلاور نے بیک مرر میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

پاشا کی نظریں ایلیٹ فورس کی ایک موبائل پک اپ کا پیچھا کر رہی تھیں۔

"ایلیٹ فورس؟"

"روٹین پٹیرولنگ کر رہے ہوں گے"، دلاور نے کالی وردی میں ملبوس پولیس کمانڈوز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے دو گاڑیاں پیچھے بھی دیکھی ہیں"

"تو؟"

"کچھ نہیں۔ چلو"

دلاور نے ایک ۔ ٹ سے گاڑی کو ریس دی۔ اس نے ہارن دیا۔ سامنے سے بھیڑ چھٹتی چلی گئی اور بابر کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ پھرتی سے سٹیئرنگ گھماتے ہوئے، ٹریفک کے رش میں سے نکلتے ہوئے وہ اپنے منتخب کردہ اڈے کی طرف بڑھنے لگے۔

بابر کو اپنی گردن کے پیچھے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوئے مگر ان کے تناؤ میں کمی

نہ آئی۔ ایک ایک سانس اسے سانس کی نالی میں خراش کرتی محسوس ہونے لگی، اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

راولپنڈی ...... فیصل آباد ...... بھکر ......پشاور ...... منڈی بہاؤالدین ...... پشاور ...... فیصل آباد ...... راولپنڈی ...... بہاولپور ...... بسوں کے شیشوں میں لگے بورڈ بابر کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔

سیالکوٹ ......!! بابر کانپ گیا۔ بہاولپور ...... رحیم یار خان ...... سیالکوٹ ......!! لیاقت پور ...... فورٹ عباس ...... سیالکوٹ ......!!!

دلاور ان میں سے کسی بھی بس کے آگے نہ رکا۔

بس سٹینڈ کے عین درمیان پہنچتے ہوئے، خلقت کے وسیع ہجوم میں رکتے ہوئے اس نے گاڑی ایک بڑے اڈے پر لا کر کھڑی کر دی۔ ایک بہت بڑا سائن بورڈ اسے سٹار لائنز پاکستان کا اڈہ بتا رہا تھا۔ اڈے پر تقریباً سات بسیں ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک بس بابر کے سامنے نکل کر ملتان کو روانہ ہو گئی۔

گاڑی کے دروازے کھلے اور پاشا نے بابر کا بازو تھام لیا۔

"چل!"

اڈے پر مسافروں کا اچھا خاصا رش تھا اور کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ٹکٹ گھر کے سامنے لوگ قطار در قطار ٹکٹیں لے رہے تھے اور خالی جگہوں میں پھل فروٹ بیچنے والے، ریڑھی والے، اخبار بیچنے والے یوں سما گئے تھے کہ کسی کو بلائے بغیر آدمی خود ہل نہیں سکتا تھا۔

گاڑی سے اتر کر پاشا نے بیگ کا سٹریپ بابر کے ہاتھ میں دے دیا۔ بیگ زیادہ بھاری نہیں تھا مگر اسے تھامتے ہوئے بابر کا ہاتھ کانپ گیا اور اس نے سٹریپ کو خود سے دور رکھتے ہوئے انگلی اور انگوٹھے کے بیچ پکڑ لیا۔

"لے بھئی"، دلاور نے سیالکوٹ کا ٹکٹ جیب سے نکال کر اسے پکڑایا،

"تیرے لمبے سفر کا ٹکٹ!"

"آ.... آپ میں سے کوئی میرے ساتھ نہیں جا رہا؟"

"ہم نے مرنا ہے؟!" دلاور ہنسا۔ پاشا نے اسے گھورا۔

"نہیں نہیں!"، دلاور اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا، "یہ مشن تمھارا ہے میرے دوست۔ اسے تمھیں ہی پورا کرنا ہوگا"۔

"یہ لو"، طارق نے آگے بڑھتے ہوئے اسے ایک شاپر پکڑایا، "رستے کے لیے"، شاپر میں جوس اور ایک بسکٹ کا ڈبہ تھا۔

"بس چلنے میں کتنی دیر ہے؟" باجوہ نے پوچھا۔

"پندرہ منٹ"

"تو جلدی سے اپنی گاڑی میں بیٹھ جا!"، دلاور باجوہ سے مخاطب ہوا، "تجھے بیٹھتے بیٹھتے بھی دس منٹ لگ جائیں گے!"

سب کھل کر ہنس دیئے۔ باجوہ نے اپنے پنجے میں دلاور کی گردن دبوچ لی۔

"ابے چھوڑ!"، دلاور چیخا اور باجوہ نے ہنستے ہوئے اس کی گردن چھوڑ دی۔

طارق نے قہقہہ لگا کر باجوہ کے شانے پر ہاتھ مارا۔

"کیا خیال ہے اپنے مسافر کو بس میں بٹھا کر نکلیں؟"، دلاور نے پاشا سے سوال کیا۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے"، طارق بولا۔

پاشا نے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لی۔ دھواں نکالتے ہوئے اس نے بابر کو دیکھا۔ بابر ایک ہاتھ میں شاپر اور دوسرے میں بیگ پکڑے کھڑا تھا۔ پاشا نے ایک ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر آئی بالوں کی لٹ کو پیچھے کیا۔ اس کی پیشانی دیکھتے ہوئے باجوہ نے ڈبی میں سے ایک اور سگریٹ نکالی۔

"میں جانتا ہوں تم سگریٹ نہیں پیتے"، وہ سگریٹ بابر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا، "مگر میں چاہوں گا تم اسے میری طرف سے رکھ لو"

دلاور کے ہونٹوں سے مسکراہٹ مٹ گئی۔ بابر نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ لے لی۔

"چلو"، پاشا نے کہا اور وہ سیالکوٹ جانے والی بس کی طرف بڑھ گئے۔

ان کی جانب سے وہ تیسری بس تھی۔ اب صرف پانچ بسیں کھڑی تھیں، دو بسیں جا چکی تھیں لیکن بابر کے سامنے لاہور واپس آتی ایک بس اپنا مخصوص ہارن بجاتے ہوئے اڈے میں داخل ہونے لگی۔

فیصل آباد جانے والی بس کے ساتھ ہوتے ہوئے وہ سیالکوٹ جانے والی بس کے دروازے پر جا پہنچے۔

بس کے دروازے پر ایک سیکورٹی گارڈ ہاتھ میں میٹل ڈیٹیکٹر پکڑے کھڑا تھا۔

بابر کی سٹی گم ہوگئی۔ اس کے نیفے میں دھاتی چھری تھی!

گارڈ بس میں چڑھنے والے ہر آدمی کے کپڑوں کے ساتھ میٹل ڈیٹیکٹر لگاتے ہوئے سب کی چیکنگ کر رہا تھا۔

بابر کے قدم رکنے لگے۔ اس کے دائیں ہاتھ پر پاشا تھا بائیں ہاتھ باجوہ اور دلاور اور طارق پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ان سب کے نیفوں میں پستول تھے اور وہ اسے اپنے بیچ لے کر چل رہے تھے۔ اس کے آگے ایک عورت اور دو آدمی کھڑے تھے۔ گارڈ نے عورت کو چیکنگ کے بغیر بس میں سوار ہونے دیا اور پہلے آدمی کو چیک کرنے لگا۔

بابر کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ اس نے چور نظروں سے باجوہ کو دیکھا جس کے چہرے کی درشتی اطمینان کے تاثرات میں ڈھلکی ہوئی تھی۔ پیچھے دلاور اور طارق آرام سے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ انہیں بم کے چیک ہونے کا کوئی ڈر نہ تھا۔ شاید بم کسی ایسی چیز میں بند تھا جو چیک نہیں ہو سکتی تھی، مگر اس کے نیفے میں دھاتی چھری تھی!

پہلا آدمی بس میں سوار ہو گیا۔ دوسرا شاید گارڈ کا جاننے والا تھا۔ وہ اس سے ہاتھ ملا کر بس میں چڑھ گیا اور بابر گارڈ کے سامنے پہنچ گیا۔ بابر کے جسم میں جیسے برقی رو دوڑ گئی۔ اس کا ہر عضو بیٹری کی طرح چارج ہو کر پھڑکنے لگا۔ اس نے شاپر بم

والے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ خالی کیا اور گارڈ نے ڈیٹیکٹر آگے بڑھ کر بابر کے جسم کے ساتھ لگا دیا۔

"پہلوان جی کی گل اے۔ آجکل دھما کے شما کے بہت ہور ہے نے؟" دلاور نے آگے بڑھ کر گارڈ سے مذاق کیا۔

گارڈ نے اپنے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ڈیٹیکٹر بابر کے پیٹ کے ساتھ گزارا۔ ڈیٹیکٹر چھری کے اوپر سے گزرتے ہوئے خاموش رہا۔ گارڈ نے اسے بابر کے بازو کے ساتھ پھیرا اور پیچھے ہٹ گیا۔

"چلو جی"، اس نے ڈیٹیکٹر سے بابر کو بس میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ بابر سکتے کے عالم میں اسے تکنے لگا۔ خوش قسمتی؟! نہیں، غالباً ڈیٹیکٹر کی بیٹری ختم ہوئی ہوئی تھی۔

پاشا نے اسے آہستہ سے دھکیلا اور بس کے دروازے کے ساتھ لگا ہینڈل تھامتے ہوئے بابر بس میں سوار ہو گیا۔

بابر کے پیچھے پاشا اور طارق بھی بس کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔ وہ دونوں نہتے تھے۔ بس کا انجن چل رہا تھا اور ایکسل کے گھومنے سے باڈی میں ہلکی ہلکی لرزش پیدا ہو رہی تھی۔ اے سی چل رہا تھا اور دونوں طرف لگی ڈبل سیٹوں کی قطار میں تیس کے قریب لوگ بیٹھے تھے۔

" ٹکٹ دکھا؟"، طارق نے بابر کے آگے سے گزرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ٹکٹ لیا۔ "اٹھارہ نمبر سیٹ"۔

طارق اور پاشا کے درمیان چلتے ہوئے وہ سیٹوں کے درمیانی راستے میں آگے بڑھنے لگا۔

"لے بھئی یہ ہے تیری سیٹ۔ بزرگو، لڑکے کو بیٹھنے کے لیے جگہ دیں گے؟"، طارق ڈبل سیٹ پر بیٹھے سانولے رنگ کے ایک آدمی سے مخاطب ہوا جس نے اپنے سر پر گھنگھریالے بالوں کی وِگ لگا رکھی تھی۔

"معاف کیجیے گا میں کوئی بزرگ نہیں ہوں!"، وہ آدمی خالص لکھنوی لہجے میں بولا، "آپ بیٹھنا چاہتے ہیں تو بیٹھ جائیے"۔ اس نے اپنا پرانا سا بریف کیس اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

"شکریہ چھوٹے بھائی"، طارق نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس نے بابر کو رستہ دیا اور بابر اس آدمی کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شاپر اور بیگ اس نے ٹانگوں کے بیچ نیچے رکھ لیا۔

"لے بھئی"، طارق نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا، "اپنا ساتھ یہیں تک تھا۔ ضیاء صاحب کی ہدایات یاد ہیں ناں؟"

بابر نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

"ٹھیک ہے"، طارق نے پاشا سے آنکھیں ملائیں، "چلیں؟"

پاشا نے تائید میں سر ہلا دیا، اور وہ دونوں چلتے ہوئے بس سے اتر گئے۔

ایک نوعمر لڑکا ڈرائیور سائیڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے سٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور بس کو ہلکی ہلکی ریس دینے لگا۔

"عجیب نامعقول آدمی تھا"، سانولا آدمی خالصتاً لکھنوی انداز میں گویا ہوا اور بابر کے ذہن میں چھایا سناٹا ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا، "خواہ مخواہ میں ایک اچھے بھلے آدمی کو بزرگ بنا گیا۔ کیا کریں صاحب، یہ سب اس مشینی دور کی قباحتیں ہیں!"

بابر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی کالی مٹیالی رنگت کی جلد تھی اور شیو اس کے گالوں کی ڈھلوان اور جھریوں کی بیچ اگی ہوئی تھی۔ پرانی طرز کے کالے فریم کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں پیلاہٹ مائل تھیں۔ اس نے پرانے زمانے کا چیک والا پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا جس کے بٹن سنہری تھے اور اس کی گھنگریالے بالوں والی وگ کے نیچے سے کہیں کہیں سفید بال جھانک رہے تھے۔

"بھائی آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟"، وہ اپنے بریف کیس کا ہینڈل زور سے پکڑے ہوئے بولا، "اس طرح کیا گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں آپ؟"

بابر چھلانگ لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہیں؟!"

ڈگ بھرتے ہوئے وہ سیٹوں کے بیچ بنے رستے میں نکل آیا۔ جوس کا ڈبہ اس کے پچھلے پیر کے نیچے آ کر پھس گیا۔

"لاحول ولا......!"

دوڑتے ہوئے بابر بس سے چھلانگ لگا کر اترا۔ گارڈ اسے دیکھ کر چونک گیا۔ بابر ایک لمحے کے لیے جھجکا۔ ہونٹ بھینچتے ہوئے وہ آگے جانے کی بجائے بس کی پچھلی طرف نکلتا چلا گیا۔ جب وہ پچھلے پہیئے کے پاس سے گزرا تو اس کی نظر کھڑکی پر پڑی۔ سانولے مسافر نے ہاتھ میں بم والا بیگ اٹھا رکھا تھا اور وہ بابر کو دیکھتے ہوئے بیگ کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

بابر بھاگتا ہوا سٹینڈ کی چھت کے نیچے پہنچ گیا۔ بسوں کے پیچھے یہاں کچھ مسافروں کے بیوی بچے کھڑے تھے۔ ساتھ ہی کینٹین تھی۔

بابر کھانسنے لگا۔ اس کا حلق بری طرح خشک ہو رہا تھا۔ ایک ٹانگ بری طرح کانپنے لگی اور اس نے ایک ہاتھ سے کینٹین کی دیوار کا سہارا لے لیا۔ معدے سے تیزاب اٹھ کر اس کے حلق میں آ گیا۔ اس نے دیوار کے ساتھ دو تین بار تھوکا اور پھر ہونٹوں پر قمیص کا پلو رکھتے ہوئے اپنی کھانسی دبانے لگا۔

ایک ہی خاندان کی کچھ عورتیں چھوٹے چھوٹے بچے سنبھالے ایک طرف کھڑی تھیں۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"اوہ!"، اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

"اوہ!"

ایک نئی زندگی کی لہر اس کی رگ و ریشے میں سرایت کر گئی۔ ہر سانس اسے میٹھی محسوس ہونے لگی۔ اس کی نسوں میں پھیلی افراتفری لطیف سکون میں بدلنے لگی۔ موت کو چھو لینے کے بعد آج اسے درحقیقت پہلی بار زندہ ہونے کا احساس ہوا تھا اور وہ

اپنے دل کی اک اک دھڑکن کو نعمت سمجھ کر اس کا احساس کرنے لگا۔

مگر کتنی دیر تک......؟

ابھی، شاید دو منٹ میں، شاید پانچ منٹ میں موت کی ہولناکی اس پوری جگہ کو اپنی لپیٹ میں لینے والی تھی۔

یہ سب...... وہ بس...... اس میں بیٹھے چالیس پچاس مسافر...... وہ گارڈ...... یہ عورتیں بچے...... یہ سب اک پل میں انسانوں سے بکھرے ہوئے لوتھڑوں میں بدلنے والے تھے۔ یہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔

اپنا بایاں پیر پٹختے ہوئے اس نے تیزی سے قدم اٹھائے۔

"اگر ان عورتوں کو بتا دوں تو؟"

"کوئی فائدہ نہیں! یہاں سے نکل! موت اپنے خوفناک پر پھیلائے کھڑی ہے"

"مگر..."

"کوئی نہیں بچے گا! سنا تو نے؟ کوئی نہیں بچے گا! ان سب کی لکھی گئی ہے۔ اگر تو بچنا چاہتا ہے تو نکل!"

بابر بھاگا۔ کینٹین کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے، اپنے اور موت کے بیچ سرگودھا اور گوجرانوالہ جانے والی بسیں رکھتے ہوئے، وہ اڈے کی دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔

دیوار کی نکڑ پہ بجلی کا ایک کھمبا لگا تھا جہاں سٹار لائنز اڈے کی حدود ختم ہوتی تھی۔ کھمبا مین روڈ کے کنارے پر تھا۔ روڈ پر اچھی خاصی ٹریفک تھی اور خلقت کا بے پناہ رش تھا۔

زندگی......!

بابر کے قدم تیز ہو گئے۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے! میں اپنا سبق سیکھ گیا ہوں مالک!"

مین روڈ اب پندرہ قدموں کے فاصلے پر تھی۔ کھمبے سے کچھ فاصلے پر ایک چنگ چی موٹر سائیکل رکشے والا مسافر رکشے میں بٹھائے ایک آخری سواری کا انتظار کر رہا تھا۔

"یا اللہ میں اپنی ہر سانس کے لیے تیرا شکر گزار ہوں! تیری..... یہ کیا؟؟!"

یک لخت اس کی بائیں ٹانگ پٹھوں کے زبردست کھچاؤ کا شکار ہو گئی۔ اس کی پنڈلی کی مچھلیاں بری طرح کھنچ گئیں اور وہ پاؤں کی ایڑھی اٹھاتے ہوئے لنگڑانے لگا۔ درد کی ٹیسیں اس کے کولہے تک اٹھنے لگیں۔

"کیوں؟!"، اس نے دنگ ہو کر خود سے سوال کیا، "یہ نہیں ہو سکتا!"

موت کا جگنو آزاد ہونے کے قریب تھا۔ شاید ابھی، شاید بالکل ابھی!

رکشے میں بیٹھے لوگ رکشے والے کو چلنے پر اکسانے لگے۔

آخری سواری.......! زندگی بچانے کا آخری موقع.......!

"یوں نہیں! یوں نہیں!"، درد سے کراہتے ہوئے، لنگڑاتے ہوئے، دیوار کا سہارا لیئے وہ آگے بڑھنے لگا۔

"مجھے جینا ہے! مجھے جینا ہے! میں مر نہیں سکتا! میری ماں میرا انتظار کر رہی ہے!"

جنون کی حالت میں، باچھیں بہاتے ہوئے، بایاں ہاتھ کولہے پر رکھے وہ بجلی کے کھمبے تک پہنچ گیا۔ رکشے والا مسافروں کی باتوں پر زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا۔

"نہیں! ٹھہرو! رکو!"، مگر رکشے والے نے اس کی آواز نہ سنی۔

بابر نے لڑکھڑا کر دائیں ہاتھ سے کھمبے کی ٹی آئرن کی سلاخ تھام لی اور پھر پوری قوت سے چیخا، "ٹھہرو!!"

رکشے والے نے موٹر سائیکل کو کک لگاتے ہوئے گردن گھما کر بابر کو دیکھا۔

"بھائی جی، جانا ہے؟"، اس نے آواز لگائی۔ باقی مسافر تنگ ہو کر بابر کو دیکھنے لگے۔ بابر نے ہانپتے ہوئے تائید میں سر ہلایا۔

"آ جاؤ پھر جلدی"

بابر نے قدم بڑھایا مگر سلاخ کے گرد لپٹا دایاں ہاتھ نہ چھوٹا اور وہ لڑکھڑا گیا۔

"بھائی جی جلدی کرو! جلدی!"

بابر بے یقین آنکھوں سے اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ اس کا جیسے اپنے اعضاء پر قابو نہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ نے اسقدر مضبوطی سے سلاخ کو پکڑ رکھا تھا کہ بابر کی انگلیاں ٹی آئرن میں کٹنے لگیں۔ اس نے ہاتھ کو کھینچا مگر بازو کی مچھلیوں کا وحشی زور نہ ٹوٹا۔ اس کا ہاتھ جیسے اسے بھاگنے سے روک رہا تھا۔ بجائے چھوٹنے کے اس کی انگلیاں مزید مضبوطی سے سلاخ کے گرد لپٹ گئیں۔ اس کے کندھے تک کے پٹھے اس اندھی طاقت کے زیرِ اثر کانپنے لگے۔

"نہیں!"، بابر نفی میں سر ہلاتے ہوئے پاگلوں کی طرح چلایا، "مجھے مرنا نہیں ہے! مجھے جینا ہے!"

رکشے والا بری طرح چونکا۔ اس نے موٹر سائیکل کو ریس دی اور رکشے کو لئے آناً فاناً ٹریفک میں گھس کر بابر کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"نہیں!"، کھمبے کو جکڑے وہ اپنے نفس میں اور باطن میں زور آزمائی کرنے لگا۔ اسقدر زبردست ذہنی ہیجان سے اس کی روح کانپنے لگی۔ ایک طرف زندہ رہنے کی خواہش تھی اور دوسری طرف.......

"نہیں! میں یہ نہیں کروں گا! میں یہ نہیں کروں گا! میں مر جاؤں گا........"

"ارے صاحب! ہم بھی تو مر جائیں گے!"، اس کے ذہن میں مخصوص لکھنوی لہجے میں آواز گونجی اور ہاتھ کا وحشی زور ٹوٹ گیا۔ بابر نے لڑکھڑاتے ہوئے دیوار کا سہارا لیا۔ اس کے پورے دائیں بازو میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔

سانولا مسافر۔ اس کی پیلاہٹ مائل آنکھیں بابر کے حواس پر چھا گئیں۔

اس کے پاس پڑا کالا بیگ......

بابر نے پوری قوت سے اپنا پیر زمین پر پٹخا اور پھر پٹخا۔ ٹانگ کے پٹھوں میں پڑا بل درد کی ایک زبردست ٹیس کے ساتھ غائب ہو گیا اور وہ درد کی غائب ہوتی شدت کے زیر اثر گہری سانس لینے لگا۔

سیالکوٹ جانے والی بس کا ہارن بجا اور اس ایک ساعت میں اس کی خود غرضی ایک آخری بار تڑپ کر ہمیشہ کے لیے مرگئی۔

وہ ان مسافروں کو مرنے نہیں دے سکتا تھا!

کیوں؟ اس ایک ساعت میں وہ جان گیا۔

وہ کیا جانا؟ اس کا شعور اسے بیان کرنے سے قاصر تھا مگر جیسے ہی ہارن کی آواز بازگشت کرتے ہوئے ختم ہوئی، بابر بس کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ ایسے دوڑا کہ شاید اب سے پہلے یا اب کے بعد دوبارہ کبھی ایسے نہ بھاگ سکتا۔ اس کا مقابلہ وقت کے ساتھ تھا۔ وقت، جو بس میں بیٹھے بے خبر مسافروں کی موت کا پروانہ بن کر ہر سیکنڈ ان کی سانسیں کم کر رہا تھا۔ وہ وقت سے تیز نہیں بھاگ سکتا تھا لیکن چند سیکنڈ میں ہی وہ بس تک پہنچ گیا۔ بس آہستہ آہستہ مین روڈ پر آ رہی تھی۔ ڈرائیور نے ہارن بجا کر ایک گاڑی والے سے رستہ لیا۔ بابر بس کے آگے سے گھوم کر دوسری سائیڈ پر آیا۔ بس کا دروازہ بند تھا۔ اس نے رک کر دونوں ہاتھوں سے شیشے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈرائیور نے اسے دیکھتے ہوئے ایک بٹن دبایا اور دروازہ کھل کر اکٹھا ہو گیا۔

بابر چھلانگ لگا کر بس میں سوار ہوا۔ دونوں طرف لگی ڈبل سیٹوں کی قطار میں مسافر بیٹھے تھے۔ صرف اٹھارہ نمبر سیٹ خالی تھی۔ کنڈیکٹر درمیانی رستے میں چلتے ہوئے سب کے ٹکٹ چیک کر رہا تھا۔

بابر انجن کے ٹاپے پر سے چھلانگ لگاتے ہوئے درمیانی رستے میں آیا۔

اس کی ٹھوکر سے ایک سفری بیگ دور تک گھسٹتا چلا گیا۔

"اوئے........"

کنڈیکٹر نے چونک کر بابر کو دیکھا۔ بابر بھاگتا ہوا کنڈیکٹر تک پہنچا۔ کنڈیکٹر چودہ نمبر سیٹ کے پاس کھڑا تھا، بابر نے رکتے ہوئے دونوں ہاتھ کنڈیکٹر کے سینے پر رکھے اور اسے پوری قوت سے پیچھے کو دھکیلا۔ کنڈیکٹر بری طرح لڑکھڑاتے ہوئے ایک بیگ پر سے الٹ کر گرا۔ مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔ بابر الٹے ہوئے بیگ کو پاؤں تلے کچلتے ہوئے اپنی سیٹ تک پہنچا۔ سانولا مسافر خوفزدہ ہو کر کھڑکی پر لگے پردے کے ساتھ دبک گیا۔ اس کے ساتھ سیٹ پر وہ کالے چمڑے کا بیگ پڑا تھا۔

بابر نے لپک کر سیٹ پر سے بیگ اُچکا اور واپس بھاگا۔ ایک دو مسافر اپنی سیٹوں سے اٹھنے لگے مگر اس سے پہلے کہ کوئی اسے پکڑتا وہ ٹاپے پر سے چھلانگ لگا کر دروازے کی سیڑھیوں میں گرا۔ اسکا پاؤں پھسلا اور اسی وقت بوکھلائے ہوئے ڈرائیور نے دروازہ بند کرنے کا بٹن دبایا۔ بابر بند ہوتے دروازے میں سے نکل کر ہاتھوں کے بل سڑک پر گرا۔ بیگ اس کے ہاتھ سے چھٹ گیا اور سڑک سے ٹکراتے ہوئے بم کی کیموفلاج کیسنگ بج اٹھی مگر بم نہیں پھٹا۔

بابر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ چھلے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے اس نے بیگ اٹھایا۔ دائیں گھٹنے پر سے اس کی شلوار پھٹ گئی تھی اور گھٹنے پر آئی خراشوں میں سے خون رسنے لگا۔

وہ بیگ کو کس طرف پھینکتا؟ ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ ہزاروں مرد عورتیں بچے۔ وہ بم کس طرف پھینکتا؟ کس کو بچا کر موت کو کس کی طرف اچھالتا۔ موت کا فرشتہ جیسے اس کی کمر پر سوار تھا اور بابر کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں......

... اور پھر اس نے اپنے ڈولتے ہوئے حواس پر قابو پاتے ہوئے بے یقینی سے پلکیں جھپکیں۔ دلاور گاڑی کے ہارن پر ہاتھ رکھے، رش میں سے تیزی سے

گاڑی نکالتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بابر کے جسم میں سے جیسے جان نکل گئی۔ کیا یہ ایک سراب تھا؟ نظر کا دھوکا تھا؟

آلٹو کے ہارن کی تیکھی آواز اس کے کانوں میں گونجی اور اس نے کانپ کر گاڑی میں آتے ان انسان نما درندوں کو دیکھا جنکی سلگتی نگاہیں اس پر تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے ایک دردناک موت کا پیغام تھا۔

بابر واپس بھاگا۔ بس کے آگے سے نکلتے ہوئے وہ دوسری طرف آیا۔ سڑک پر تاحد نگاہ ٹریفک ہی ٹریفک تھی۔ لوگ ہی لوگ تھے۔ وہ بم کو لے کر کس طرف بھاگتا؟ کتنی دور بھاگتا؟ ہر طرف سے بلند ہوتے شور سے اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ کسی طرف بھی بھاگنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

"دیکھ کے!"، ایک گھنٹی بجی اور ایک سائیکل بابر کی پشت سے ٹکرائی۔ بابر لڑکھڑایا اور سائیکل پر سوار آدمی سڑک پر جا گرا۔

"اوئے انا ایں؟!" وہ آدمی چلایا۔

بابر گھوما اور اسے اس آدمی کے پیچھے سفید آلٹو کا بونٹ نظر آیا۔ دلاور نے ہارن بجایا اور وہ آدمی پھر چیخا، "اوئے کی اے؟!"

بابر بھاگا۔

گاڑی کے پہیے چنگھاڑے اور دلاور نے گاڑی سڑک پر پڑے آدمی کی ٹانگ پر چڑھا دی۔ وہ آدمی پوری قوت سے چیخا۔

بابر سڑک پر اندھا دھند بھاگنے لگا مگر رش جیسے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ہر طرف بسیں، ویگنیں ہی ویگنیں، لوگ ہی لوگ۔ خود سمیت، وہ جس طرف بھی بھاگتا، بہت سے انسانوں کی موت یقینی تھی۔ پیچھے دلاور بار بار ہارن دے رہا تھا اور ہر بار بابر کو ہارن اپنے بالکل پیچھے سنائی دیا۔ ایک موٹر سائیکل رکشے کے آگے سے نکلتے ہوئے بابر بادامی باغ سے باہر جانے والی مرکزی شاہراہ پر پہنچ گیا........

........اور جیسے دریا میں سے نکل کر وہ سمندر میں پہنچ گیا۔

وہ اب بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیئے کہ کسی طرف بھاگنے کیلیئے رستہ ہی نہیں تھا۔ بسیں، ٹرک، گاڑیاں، ویگنیں، موٹر سائیکل، رکشے، ٹھیلے، راہگیر، محنت کش، لوڈر، مسافر، دکاندار، تانگے والے، گھوڑے، گدھے، خچر.......

اس نے مڑ کر دیکھا۔ آلٹو اب اس کے پیچھے نہیں تھی۔ اس کے سامنے ایک نسان سَنّی کھڑی تھی۔ بابر دوڑ کر اس کی ڈگی پر چڑھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھے لوگ بوکھلا گئے۔ چھلانگ لگا کر بابر گاڑی کی چھت پر چڑھا۔ گاڑی کے دروازے کھلے.. .....

بابر نے کندھے سے لٹکا بیگ اتار کر ایک ہاتھ سے ہوا میں بلند کیا۔

"اس میں بم ہے.......!!!!"

غصے میں بھرا گاڑی کا ڈرائیور بوکھلا کر ایکدم پیچھے ہو گیا۔

"اس میں بم ہے.......!!!!"، آنکھیں بند کرتے ہوئے بابر اپنی پوری قوت سے چلایا۔ گاڑیوں کے زبردست شور میں بھی اس کی آواز کچھ دور تک سنی گئی۔

گاڑی کے پچھلے دروازے کھلے اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھی عورتیں اور بچے چیخیں مارتے ہوئے گاڑی میں سے اترے۔

"اس میں......!!!"

گولی چلنے کا دھماکہ ہوا اور بھگدڑ مچ گئی۔ بابر چھلانگ لگا کر گاڑی کے بونٹ پر گرا اور اس پر سے پھسلتے ہوئے اترا۔ زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگ اپنی سواریاں چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ بابر نے بھی ان کے ساتھ بھاگنا چاہا مگر اس جگہ کو خالی کرانا ہی اس کا مقصد تھا۔

"اس میں بم ہے.......!!!"، لوکل ٹرانسپورٹ کی ایک بس کے مسافروں کو بیگ دکھاتے ہوئے وہ چلایا۔ لوگ چیخیں مارتے ہوئے، ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے بس سے اترنے لگے۔ تانگے والے اپنے گھوڑے چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ پیدل چلنے والے ایک دوسرے سے بری طرح ٹکراتے ہوئے گرتے پڑتے ہر طرف کو بھاگنے

لگے۔ کسی نے بیگ بابر سے چھین کر پرے پھینکنے کی کوشش کی، مگر بابر نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں لات ماری اور وہ آدمی دہرا ہو کر گر پڑا۔

"اس میں........!!!!"

"بابر!!!"

بابر گھوما اور اسی وقت ایک اور گولی چلنے کا دھماکہ ہوا اور "پھٹاک!" کی آواز کے ساتھ بابر کے پاس کھڑی خالی گاڑی کے دروازے میں سوراخ ہو گیا۔ قیامت کا شور برپا ہو گیا۔ گاڑیوں والے رش میں سے نکلنے کی کوشش میں پیدل بھاگنے والوں کو کچلنے لگے۔ ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی اور اس سب کے بیچ بابر کی نظریں پاشا کی آنکھوں سے دوچار ہوئیں۔ دلاور، طارق اور باجوہ خالی ہوتی گاڑیوں، بھاگتے لوگوں، خوف سے چیختے گھوڑوں کے بیچ میں سے رستہ بناتے ہوئے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پاشا نے پھر بابر کا نشانہ لیا۔ بابر دوہرا ہو کر گاڑیوں کے پیچھے چھپتے ہوئے ایک طرف کو بھاگنے لگا۔

"پولیس!!"، لاؤڈ سپیکروں پر سے چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں، "اپنے ہتھیار ڈال دو! تمھیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے!!"

بابر کے گرد ایک دائرے کی شکل میں جگہ خالی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے قریب اب صرف سڑک پر پڑے کراہتے ہوئے زخمی لوگ اور خوفزدہ جانور تھے۔ بم کو اب کہیں بھی چھپایا جا سکتا تھا۔ اس نے ایک خالی کرولا گاڑی کا دروازہ کھولا اور کندھے سے بیگ اتارتے ہوئے......

"حرامزادے!!" دلاور نے اچھل کر ایک گاڑی کی ڈگی پر چڑھتے ہوئے فائر کیا اور کرولا کا پچھلا پہیہ ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ ٹائر کے چیتھڑے اڑ گئے اور بابر لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ گرتے ہی اسے گاڑیوں کے نیچے سے باجوہ کے بھاگتے ہوئے بھاری پاؤں نظر آئے۔ بابر سڑک پر اپنے ہاتھ، پیر اور گھٹنے چھیلتے ہوئے پاس

کھڑی بس کے نیچے رینگ گیا۔ بس کی دوسری طرف پہنچ کر وہ اٹھ کر بھاگا۔

"وہ رہا"، ایک دھماکے سے گولی چلی اور بابر کے پیچھے کسی گاڑی کا شیشہ چھناکے سے چکنا چور ہو گیا۔ بابر اندھا دھند بھاگنے لگا۔

"کتے!!!"

"خبردار!!"، یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے اور پھر ایک دردناک چیخ گونج اٹھی۔

بابر نے مڑ کر دیکھا طارق سڑک پر گر کر تڑپ رہا تھا۔

ایک بار پھر گولیاں چلنے کے زبردست دھماکے ہوئے اور پاشا نے چلاتے ہوئے باقیوں سے کچھ کہا۔ ایک کالی وردی میں ملبوس پولیس کمانڈو بھاگتا ہوا طارق کے پیچھے سے آ نکلا۔ بابر کو دیکھ کر وہ ٹھٹھکا اور اس نے......

"نہیں نہیں نہیں!!!"، دھماکہ ہوا اور گولی سائیں سے بابر کے پاس سے گزر گئی۔ بابر پلٹ کر بھاگا۔

"کوڈ بلیو.......! کوڈ بلیو.......!"، لاؤڈ سپیکر چنگھاڑے، "کمانڈوز کوڈ بلیو! بیگ والے نوجوان کے پاس بم ہے.......! نوجوان.......! اگر تم سن رہے ہو، ہم جانتے ہیں تم دہشت گرد نہیں ہو.......! بم کو لے کر فوراً لکشمی گڈز کے گودام کے سامنے پہنچو! اگر تم پل کے پاس ہو تو یہ تمھارے دائیں ہاتھ پر ہے! تمھیں پورا تحفظ دیا جائے گا.......! کوڈ بلیو! کوڈ بلیو.......! کمانڈوز، کوڈ بلیو.......!!"

"باجوہ!"، اس کے بائیں طرف سے دلاور کی آواز آئی، "یہ نکلنے نہ پائے!!"

"خبردار!!"، پے در پے دھماکے ہوئے اور دلاور کی دلدوز چیخ فضا میں بلند ہوئی۔

بابر کانپتی ٹانگوں پر بھاگتے ہوئے اپنے دائیں طرف کو نکلنے لگا۔

پل پر لوگوں کا بے پناہ رش تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ پل کی دیوار پر

چڑھے نیچے شاہراہ پہ بلی چوہے کا یہ کھیل دیکھ رہے تھے۔

ایک گری ہوئی موٹر سائیکل کے اوپر سے چھلانگ لگاتے ہوئے، مرغیوں سے بھری ایک پولٹری ویگن کے پیچھے سے نکلتے ہوئے بابر گوداموں والی سائیڈ پر نکل آیا۔ اس طرف تا حدِ نظر گودام ہی گودام اور لوڈنگ سٹینڈ، ٹرک اور شیڈ تھے۔

دو سو قدم کے فاصلے پر اسے ایک گودام کے اوپر لکشمی گڈز کا بڑا سا بورڈ نظر آیا۔ بابر اس طرف کو بھاگنے لگا۔

"وہ رہا!!"، بابر کو گاڑیوں میں سے نکلتے دیکھ کر کوئی میگا فون پر بولا۔ گودام کے سامنے تین پولیس موبائل گاڑیاں اور خودکار اسلحہ سنبھالے بہت سے پولیس کمانڈو کھڑے تھے۔

"نوجوان......! چلے آؤ! یہاں پر بم ڈسپوزل سکواڈ تمھارے لئے تیار کھڑا ہے......! چلے آؤ......!!"

بابر کے پیچھے باجوہ ڈکراتا ہوا گاڑیوں کی قطار میں سے نکلا۔

"ہالٹ!!"

"خبردار!!" میگا فون والے نے باجوہ کو للکارا۔

بابر بوکھلا کر رکنے لگا۔

"رکو نہیں نوجوان......! تم خطرے میں ہو......! رکو نہیں"

گودام کے سامنے کھڑے کمانڈو نیم دائرے کی شکل میں پھیلنے لگے۔ بابر کو بچاتے ہوئے وہ باجوہ کو اپنی لائن آف فائر میں لانے لگے۔

بابر سے اب گودام سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ گودام کے دیوہیکل دروازے کھلے اور بابر کو اندر بھاری سوٹوں میں چھپے بم ڈسپوزل سکواڈ کے افراد نظر آنے لگے۔

باجوہ کے پیچھے پاشا بھی نکل آیا۔

"خبردار! اپنے ہتھیار ڈال دو! ورنہ موت کے گھاٹ اتار دیئے جاؤ گے! تم چاروں طرف سے گھیر لئے گئے ہو! تم بچ نہیں سکتے! اپنے ہتھیار ڈال دو! اپنے......"

بابر کو حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ میگا فون پر بولنے والا آدمی وہی تھا جسے اس نے ملک داؤد کی کوٹھی کے سامنے والے مکان کی کھڑکی میں دیکھا تھا۔ وہی آنکھیں، وہی مونچھیں......!! وہ آدمی پولیس والا تھا......!!

"نوجوان بچو......!!!"

"باجوہ بم کو نہیں......!!"

باجوہ نے چنگھاڑتے ہوئے بابر کے شانے سے جھولتے بیگ کا نشانہ لے کر پستول کی لبلبی دبائی۔

ایک دھماکے سے گولی چلی اور بابر کو لگا جیسے کوئی شے انتہائی قوت سے اس کی پشت سے ٹکرائی۔ تھوک نگلتے ہوئے اس کے گلے کی گھنٹی نیچے رہ کر گردن میں پھنس گئی۔

اسے زوردار دھکا لگا اور گولی اس کے کندھوں کی بیچ گھستی چلی گئی۔

بابر کے پیروں نے زمین چھوڑ دی اور ہاتھ پھیلائے وہ جیسے ہوا میں اڑنے لگا۔

اس قدر خوبصورت احساس!

اس کا سایہ اس کے نیچے زمین پر تیر رہا تھا۔ کچی زمین میں ابھری اینٹوں کے سنہری دھوپ میں کالے سائے، بابر کے ذہن میں نقش ہوتے چلے گئے۔

وہ سر کے بل زمین سے ٹکرایا اور اپنے پورے وزن کی قوت تلے اس کی ناک اور سامنے کے دانت ٹوٹتے چلے گئے۔

"دھپ!" سے وہ زمین پر گرا اور حلق میں سے ابلتے خون کا ایک چشمہ اس کا منہ بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مٹی پڑ گئی اور وہ واضح طور پر اسے اپنی پلکوں کے پیچھے بیٹھتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ دھماکے سے اس کے گرنے سے زمین پر سے گرد اٹھنے لگی۔ سورج کی دھوپ میں وہ لاکھوں کروڑوں ننھے سنہری ذرّات ایک عظیم کائناتی رقص میں مرغولے کھانے لگے۔ ان ننھے ذرات کی ازلی حقیقت میں بابر کو اپنی زندگی

کی حقیقت موجزن نظر آئی اور اک عظیم سکون کے احساس سے بابر کے رگ و ریشے ٹھنڈے پڑنے لگے۔

دو آدمی لڑتے ہوئے اس کے پاس گر پڑے اور بابر نے بوجھل نظروں سے انہیں دیکھا۔

جری کمانڈو باجوہ کی زخمی ٹانگ مروڑتے ہوئے اس کی کمر پر سوار ہو گیا۔ باجوہ کی چیخیں نکل گئیں۔ کمانڈو نے اپنی خودکار بندوق کا دستہ باجوہ کے سر کی پشت پر مارا اور باجوہ اک آہ لے کر ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے ہاتھوں کو ہتھکڑی لگا کر کمانڈو اٹھ کر کھڑا ہوا۔ تب اسے خون کے اس گہرے رنگ کے دائرے کا احساس ہوا جو زمین پر اوندھے پڑے لڑکے کی کمر سے پھیل رہا تھا۔

فریدا خاک نہ نندیئے! خاک جیڈ نہ کوء
جیوندیاں پیراں تلے مویاں اپر ہوء